ISSN 2321-4627

فروری، مارچ 2022ء

-/15 روپے

ماہنامہ

قومی زبان

حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی، تہذیبی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

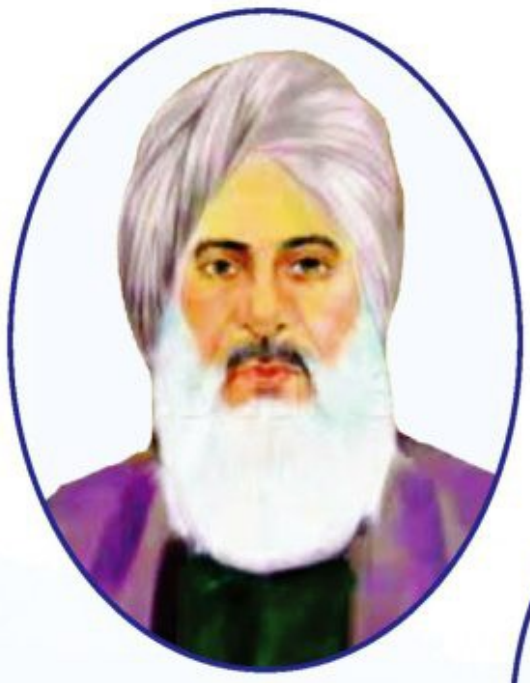

امیر مینائی

شوکت تھانوی

مخدوم محی الدین

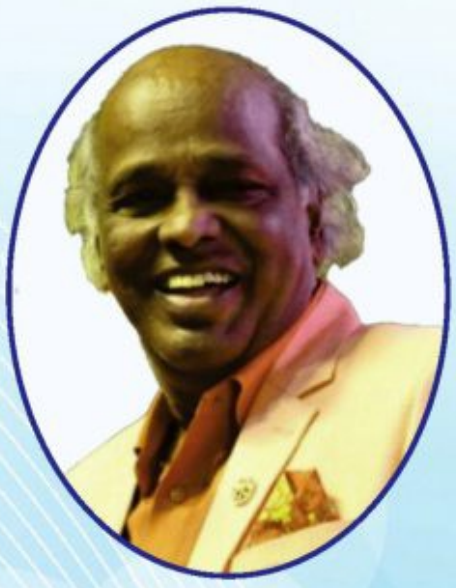

راحت اندوری

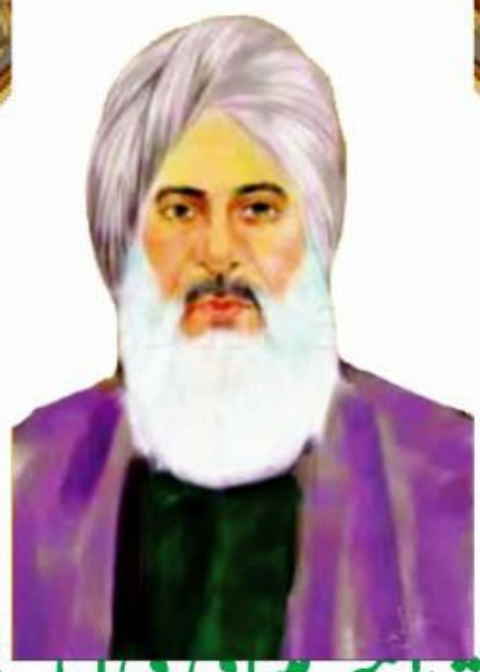

حضرت امیر مینائی کی ایک غزل

اس کی حسرت ہے جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں
ڈال کے خاک میرے خون پہ قاتل نے کہا
کچھ یہ مہندی نہیں میری کہ چھپا بھی نہ سکوں
ضبط کمبخت نے یاں آکے گلا گھونٹا ہے
کہ اسے حال سناؤں تو سنا بھی نہ سکوں
نقش پا دیکھ تو لوں لاکھ کروں گا سجدے
سر مرا عرش نہیں ہے جو جھکا بھی نہ سکوں
بے وفا لکھتے ہیں وہ اپنے قلم سے مجھ کو
یہ وہ قسمت کا لکھا ہے جو مٹا بھی نہ سکوں
اس طرح سوئے ہے سر رکھ کے میرے زانو پر
اپنی سوئی ہوئی قسمت کو جگا بھی نہ سکوں

www.urduacademyts.com

قرینہ

ہم کلامی	:	شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس	4

یادرفتگاں

امیر مینائی	:	نواب فصاحت جنگ جلیلؔ	5
مخدوم محی الدین	:	شاذؔ تمکنت	11
اے ایس بی	:	شوکت تھانوی	16
ڈاکٹر راحت اندوری سے پہلی اور آخری ملاقات	:	حافظ قاری ڈاکٹر محمد نصیر الدین منشاوی	21

مضامین

انفارمیشن ٹکنالوجی اور اردو۔ روزگار کے مواقع	:	ڈاکٹر محمد نثار احمد	27
آن لائن اُردو کی تدریس میں گوگل کی خدمات	:	ڈاکٹر عائشہ بیگم	31
معاشرہ پر ذرائع ابلاغ کا اثر	:	ڈاکٹر محمد خواجہ مخدوم محی الدین	39
تاریخ دکن کے چند اہم مصادر	:	ڈاکٹر محمد عرفان احمد	42
بہمنی دور حکومت میں علم و ادب	:	ذیشان سارہ	48
ناول ''برف آشنا پرندے'' کا تہذیبی مطالعہ	:	مدثر احمد گنائی	52
اردو صحافت کا سفر	:	محمد تنویر	57
پروفیسر اشرف رفیع ایک ہمہ گیر شخصیت	:	مقبول حسین	63
پروفیسر محمد انور الدین بہ حیثیت تحقیق نگار	:	فاطمہ اختر	68
اکیسویں صدی میں اسلوبیاتی تنقید	:	ارشاد احمد	74
دکنی تحقیق میں اسلم مرزا کے اِضافے	:	سیدہ فاطمہ انساء اسماء	82

افسانے

وہ کوئی اور تھا	:	ڈاکٹر محبوب فرید	86
تیسری شخصیت	:	حنیف سیّد	88

حصہ نظم

غزلیں	:	مومن خان شوقؔ / ڈاکٹر فاروق شکیلؔ	91
نظم / غزل	:	سردار سلیمؔ / جمال عباس فہمیؔ	92
غزلیں	:	ارشدؔ شرفی / یوسف قدیر	93
غزلیں	:	عمران راقم / حمید عکسیؔ	94

oOo

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و تنقیدی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد : 07 شمارہ : 03-02 فروری، مارچ 2022ء

ایڈیٹر

شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس

ڈائریکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی

حیدرآباد-500 001 (تلنگانہ)

مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب و تزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages : 84

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Shah Nawaz Qasim and published by Shah Nawaz Qasim on behalf of Telangana State Urdu Academy Minorities Welfare Dept., Government of Telangana. Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

www.urduacademyts.com

ہم کلامی

بعض ناگزیر وجوہات کی بناء ماہنامہ قومی زبان کا ماہ فروری 2022ء کا شمارہ اپنے وقت پر شائع نہ ہوسکا۔اس لئے ہم نے ماہ فروری اور مارچ 2022ء کے شمارے کو ایک کر کے شائع کیا ہے۔اس تاخیر کے لئے ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اُردو کے فروغ بقاو تحفظ کا کام مختلف سالانہ اسکیمات کے ذریعہ کرتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اپنے ترجمان ماہنامہ قومی زبان میں ادباء' شعراء اور اسکالرس کے معیاری مضامین کی اشاعت کے ذریعہ زبان وادب کے فروغ میں حصہ لے رہی ہے۔اس ضمن میں اس رسالے میں ''یادرفتگان'' کے عنوان سے ایک سلسلہ جاری ہے جس میں مایہ ناز وممتاز دانشور' ادباء' شعرائے کرام' محققین جنہوں نے اس زبان کی ترقی و ترویج کی خاطر اپنی زندگیاں لگادیں اور زبان وادب کا سرمایہ ہم تک پہنچایا' ان کے کوائف اور کارناموں کا ذکر ہوتا ہے' جو ہمارے اسکالرز کے لئے فائدہ مند ہے اور اس کے ذریعہ نئی نسل کو بھی ہمارے اسلاف کے کارناموں کا علم ہوتا ہے۔آج جب کہ ہماری نئی نسل اردو زبان سے دور ہو رہی ہے' ایسے میں اس کی ترغیب کے لئے متقدمین کے کارناموں اور اردو زبان کے تئیں ان کی خدمات سے اسے واقف کروانا بہت ضروری ہے۔اسی مقصد کے تحت ماہ فروری/مارچ 2022ء کے شمارے میں یادرفتگان کے عنوان کے تحت ہم نے ہندوستان کے مایہ ناز استاد ادیب و شاعر درویش صفت شخصیت حضرت امیر مینائیؒ پر استاذ السلطان نواب فصاحت جنگ جلیل کے مضمون سے چند اقتباسات' اس کے بعد دکن کے مشہور انقلابی شاعر مخدوم محی الدین پر دکن ہی کے ایک ممتاز شاعر شاذ تمکنت کا مضمون' طنز و مزاح کے ممتاز تحریر نگار شوکت تھانوی کی اے ایس بی کے عنوان سے دلچسپ مضمون اور موجودہ دور کے ممتاز شاعر راحت اندوری پر مضمون شائع کیا ہے۔اس کے علاوہ اس شمارے میں ''انفارمیشن ٹکنالوجی اور اردو۔روزگار کے مواقع'' ''آن لائن اردو تدریس میں گوگل کی خدمات'' ''معاشرہ پر ذرائع ابلاغ کا اثر'' ''تاریخ دکن کے اہم مصادر'' ''بہمنی دور حکومت میں علم وادب'' ریسرچ اسکالرز کے مضامین' اسی طرح حسب معمول ممتاز افسانہ نگاروں کے دلچسپ افسانے اور آخر میں ممتاز شعرائے کرام کا کلام شائع کیا گیا ہے۔امید کہ یہ نگارشات ریسرچ اسکالرس کے علمی مدارج طے کرنے میں معاون ثابت ہوں گی اور قارئین ومحبان اردو کے لئے معلومات اور دلچسپیوں کا باعث بنیں گی۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی جیسا کہ گفتگو کی ابتداء میں ذکر کیا گیا' اپنی اسکیمات کی تکمیل میں مصروف ہے۔اکیڈیمی نے سات اسکیمات کے لئے درخواستیں طلب کی ہیں جن میں الیکٹرانک میڈیا کے رپورٹرس کو مالی اعانت برائے سال 22-2021' اردو کے چھوٹے اخبارات کی مالی اعانت برائے سال 22-2021' اُردو مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت برائے سال 2020' اردو کی مطبوعات پر انعامات برائے سال 2019 اور 2020' بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈ برائے سال 20-2019 اور 21-2020 اور اُردو کی مجموعی خدمات پر ''کارنامہ حیات ایوارڈ'' برائے سال 2018' 2019 اور 2020 شامل ہیں۔ان تمام اسکیموں کے لئے درخواستوں کے ادخال کی آخری تاریخ 15 فروری 2022ء رکھی گئی تھی۔اس سلسلہ میں بڑی تعداد میں درخواستیں وصول ہوئی ہیں جن کی تنقیح' جانچ اور ان کی منظوری وانتخاب کے لئے زمرہ وار کمیٹیاں تشکیل دی جائیں گی اور بہت جلد ان تمام اسکیمات کی عمل آوری کردی جائے گی۔

آخر میں ادباء واسکالرز سے التماس ہے کہ شعروادب کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کے لحاظ سے اس زبان کو سائنس وٹکنالوجی سے بھی مربوط کرنے کی کوشش کریں۔اس ضمن میں قومی زبان کے لئے سائنسی مضامین بھی روانہ کریں۔

بہرحال ہماری کوشش ہوگی کہ اردو زبان وادب کی ترقی کی کوشش میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔قارئین واساتذہ' محبان اردو اور اسکالرز سے گذارش ہے کہ اپنے زرّین مشوروں سے نوازتے رہیں۔

شاہ نواز

شاہ نواز قاسم آئی پی ایس

ایڈیٹر

www.urduacademyts.com

اُستاذ السلطان جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

امیر مینائی

لکھنؤ جب لکھنؤ تھا تو اس کی آبادی بہت گنجان اور طول وعرض چودہ پندرہ کوس تھا۔ شرفا کی آبادی بہت زیادہ تھی ہر قوم اور ہر طبقے کے شریفوں کا مامن ومسکن اور گلشن بے خزاں کہا جاتا تھا۔ نواب آصف الدولہ فردوس منزل کے امام باڑے کے سامنے جس میدان میں اس بقت حضرت قطب الاقطاب مخدوم شیخ محمد شاہ مینا رحمتہ اللہ علیہ کا مزار پرانور ہے یہاں ایک محلّہ مینا بازار نام آباد تھا اسی محلے میں جناب مولوی شیخ کرم محمد مینائی ایک عالم باعمل زہد ورع میں مشہور بزرگ رہتے تھے جن کا سلسلہ حسب حضرات ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔

مولوی شیخ کرم محمد مینائی کے چھوٹے صاحبزادے حضرت منشی امیر احمد امیر مینائی ہیں۔ جن کی مختصر سوانح عمری اسوقت میں لکھ رہا ہوں۔

امیر کے مورث اعلیٰ عثمان عرب سے ہندوستان آئے اور دارالخلافہ دہلی میں رہے۔ وہاں سے جونپور اور قصبۂ دلمو میں قیام کرتے ہوئے لکھنؤ آئے اور اقامت پذیر ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے فرزند شیخ قطب کو یادگار چھوڑا جن کی پشت سے ایک آفتاب ولایت طالع ہوا جس کے انوار سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں، یعنے شیخ محمد عرف مخدوم شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ۔

سلسلۂ نسب کی ترتیب یہ ہے، امیر احمد بن شیخ کرم محمدؒ ابن شیخ محمدؒ ابن شیخ محمد عظیم ابن شیخ خواجہ محمد ابن شیخ صالح ابن شیخ خواجہ ابن شیخ مبارک ابن شیخ معین، ابن شیخ گدائی ابن شیخ نظام ابن شیخ الہدو ابن شیخ ابراہیم ابن شیخ قطب الدین جانشیں و باورزادہ مخدوم شاہ مینار حمۃ اللہ علیہ ابن شیخ نصیرالدین ابن شیخ قطب ابن شیخ عثمان۔

مولوی شیخ کرم محمدؒ اپنے خاندان کی قابل فخر یادگار اور جانشیں تھے۔ یہ خاندان علم وفضل اور درویشی کی حیثیت سے معزز ومحترم تھا۔ علاوہ عوام الناس کے شاہی خاندان میں بھی وہ موقر تھا۔ اطمینان اور آزدای کے ساتھ علوم وفنون۔ مجاہدہ اور مشاہدہ میں مصروف تھے۔ مولوی شیخ کرم محمدؒ نے تین بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑ کر انتقال فرمایا اور لکھنؤ ہی میں دفن ہوئے۔ امیر مرحوم اپنی ایک بہن سے بڑے باقی سب بھائی بہنوں سے چھوٹے تھے۔

بھائیوں میں سب سے بڑے مفتی طالب حسن مرحوم تھے۔ پہلے یہ عدالت دیوانی لکھنو میں ملازم رہے، پھر وہیں کی نظامتوں میں میر منشی ہوئے۔ جب غدر کا طوفان اُٹھا تو یہ رامپور چلے آئے اور انیس برس عدالت دیوانی کے اعلی حاکم رہے، چھتر سال کی عمر میں بمقام رامپور رحلت کی اور وہیں دفن ہوئے۔ بہت ہی کریم النفس اور عمدہ صفات کے

www.urduacademyts.com

بزرگ اور منشی بے بدل تھے۔

شیخ عنایت حسین منجھلے بھائی کا نام تھا۔ یہ جید عالم تھے۔ تمام عمر درس و تدریس میں بسر کردی۔ اُن کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ قرآن مجید ایک مہینے میں حفظ کر کے سنا دیا تھا۔ لکھنو میں ان کا انتقال ہوا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تعلیم و تربیت:

حضرت امیر کی ولادت ۱۶ شعبان روز دوشنبہ ۱۲۴۴ء میں بعہد دولت نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئی۔ بہت ہی کم عمری میں ابتدائی تعلیم شروع کی گئی اور جیسا کہ دستور ہے ایک مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم کا آغاز کرایا، عام لڑکوں کے خلاف مستعدی اور تعلیمی شوق و ذوق ایک طرف تو قدرت نے عطا کیا ہی تھا دوسری طرف اُس موثر تربیت کا نتیجہ تھا جو مولوی شیخ کرم محمدؒ اپنے ہونہار فرزند کو دے رہے تھے۔

اُس زمانے میں عربی علوم و فنون کی تکمیل ضروری سمجھی جاتی تھی خصوصاً اس نامور اور اہل علم کے خاندان میں عربی کی تعلیم لازمی تھی جس کے اکثر افراد عربی علوم و فنون کے ماہر تھے گیارہویں برس امیر مرحوم نے عربی زبان کی ابتدائی کتابیں اپنے منجھلے بھائی حافظ عنایت حسین سے شروع کیں جو اپنی آبائی مسند پر متمکن ہو چکے تھے اور فیض تعلیم اُن سے جاری تھا۔

امیر مرحوم کی عمر ابھی نو برس چھ مہینے کی تھی کہ اُن کو یتیمی کا داغ نصب ہو یعنی اُن کے والد شیخ کرم محمدؒ نے دنیائے ناپا سدار سے رحلت کی۔ یہ ایسا سخت حادثہ تھا جس سے غالباً امیر مرحوم کی آئندہ تعلیم و تربیت پر خراب اثر پڑتا مگر خوش نصیبی سے اُن کے بڑے بھائی مفتی طالب حسن مرحوم جو اُس وقت میر منشی نظامت اور برسر عروج تھے، چھوٹے بھائی کی پرورش اور تربیت میں شفیق باپ کی طرح مصروف رہے چنانچہ امیر مرحوم خود ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''بڑے بھائی کے تادمِ حیات مجھے کبھی اس کا موقع نہیں ملا کہ میں اپنے والد ماجد کا سایہ شفقت سر سے اٹھ جانے کا اثر محسوس کرتا''

الغرض مفتی طالب حسن مرحوم کے حسن توجہ سے امیر کا سلسلہ تعلیم ٹوٹنے نہ پایا بلکہ انھوں نے بیش از بیش اُن کی تربیت و تعلیم پر توجہ کی۔ عربی صرف و نحو کی تکمیل امیر نے اپنے منجھلے بھائی سے کی، اس کے بعد دیگر اساتذہ سے مختلف علوم عربیہ کی تکمیل کا قصد کیا۔

فرنگی محل میں علم و فضل کے چشمے اُبل رہے تھے۔ حضرت امیر کو بھی اس آب حیات سے سیراب ہونے کا موقع ملا۔ مفتی محمدؒ یوسف صاحب اور مولانا عبدالحکیم صاحب سے آپ نے منقولات کی تحصیل کی اور معقولات مفتی سعد اللہ صاحب سے پڑھے اور مولوی تراب علی صاحب لکھنوی سے ادب کی تکمیل کی۔ یہ بات اُس وقت خواصِ شہر میں مشہور ہوگئی تھی کہ ادب کی طرف مولوی امیر احمد مینائی کا رجحان زیادہ ہے اور یہ معانی و بیان کی کتابیں نہایت صفائی سے طلبہ کو پڑھاتے ہیں۔ جامع العلوم ہو کر اور سند فضیلت حاصل کرنے

www.urduacademyts.com

کے بعد آپ نے علم طب کی طرف توجہ کی اور نواب حکیم محمد حسن خاں بریلوی سے اس فن کو بھی حاصل کیا۔ نواب صاحب حکیم مرزا محمد علی صاحب کے شاگرد رشید تھے اور اُس وقت مرزا محمد علی سے زیادہ نامور طبیب کوئی دوسرا نہ تھا۔ اُن کے قصے زبانوں پر آج تک ہیں۔ گو علم جفر امیر نے کسی سے پڑھا نہیں مگر مطالعہ کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ علم جفر کے ماہر ہو گئے تھے۔ اس علم میں آپ نے دو کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ ''رمز الغیب اور رُموز غیبیہ'' ان دونوں کا نام ہے۔ غرض کہ جملہ علوم پر آپ کی نظر عالمانہ و فاضلانہ تھی۔ انیس بیس برس کی عمر میں آپ فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔

سلوک و درویشی:

فقر اور درویشی آپ کی گھٹی میں پڑی تھی کیونکہ وہ خاندان ہی درویشوں کا تھا، زہد و تقوے کے دامن میں اُنھوں نے پرورش پائی۔ ریاضت و عبادت کے آغوش میں ترتیب ہوئی، ہوش سنبھالا، آنکھ کھول کر دیکھا تو گھر میں سب کو ایسی رنگ درویشی میں ڈوبا ہوا پایا۔ امیر مرحوم حضرت شاہ میناؒ سے فیض باطن حاصل کرنا شروع کیا۔ بیشتر اوقات مزار پر بیٹھے مراقب رہا کرتے تھے اور ذکر و اشغال طریقۂ آبائی میں مشغول رہ کر بطور خود دریافت کرتے تھے۔ مخدوم شاہ میناؒ کی روح پر فتوح تعلیم باطنی کی طرف متوجہ تھی اور اُسی جانب سے بعنایت الٰہی امیر کی تربیت ہوتی رہی۔

ہنوز کسی شیخ سے بیعت ظاہری کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک دن مراقبے میں معلوم ہوا کہ حضرت شاہ میناؒ نے ایک درویش کی صورت اُن کو دکھا کر ارشاد فرمایا کہ تم ان کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔ بعد ازاں خواب میں بھی اس واقعہ کو کئی بار دیکھا اور منتظر رہے کہ وہ درویش جن کی صورت دکھائی گئی ہے مل جائیں تو ارشاد مخدوم صاحبؒ کی تعمیل کی جائے۔ مزار پر کثرت سے درویش نزدیک دور کے حاضر ہوا کرتے تھے اور ہر ایک نئے آنے والے سے امیر مرحوم ملتے تھے اور اپنے مقصود کے جویا رہتے تھے۔ اسی اثنا میں اسی صورت کے ایک بزرگ جن کی تلاش تھی مزار پُرانوار پر حاضر ہوئے۔ یہ درویش امیر شاہ نام ریاست رامپور کے رہنے والے سلسلہ چشتیہ صابریہ کے شیخ تھے۔ امیر مرحوم نے ان کو پہچان لیا اور بے اختیار اُن کی طرف متوجہ ہوئے۔ میاں امیر شاہ بھی اُن کو دیکھ کر مسکرائے اور کہا کہ اب وقت تمہاری بیعت کا آگیا ہے غرض اُن کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلسلہ صابریہ کے اشغال میں حسب ہدایت شیخ مشغول ہوئے امیر شاہ صاحب آستانۂ مبارک پر بہت عرصے تک مقیم رہے اور حسن اتفاق دیکھئے کہ جب لکھنو مٹ گیا تو امیر رامپور ہی میں جا کے مقیم ہوئے جو اُن کے شیخ کا مسکن تھا۔ گویا یہ کشش شیخ ہی کے طرف سے ہوئی۔ جب تک شیخ زندہ رہے دونوں یکجا رہے اور امیر نے تمام مدارجِ سلوک طے کر کے خلافت نامہ شیخ سے حاصل کر لیا۔ آپ نے مخصوص اشخاص کو مرید کیا اور سلوک کی تعلیم دی لیکن بوجہ مشغولی خدمت سلاطین سلسلہ پیری مریدی بڑھایا نہیں۔

ابتدائے سلوک میں امیر پر ایسی محویت طاری ہوئی

www.urduacademyts.com

اور ایسا استغراق ہوا کہ دنیا کے سب کام کاج سے معطل ہو گئے یہ حال دیکھ کے اُن کی والدہ ماجدہ نے شیخ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ ایسی توجہ فرمائیے کہ اس حالت میں سکون ہو اور دنیاوی امور کی طرف بھی امیر متوجہ ہوں۔ شیخ نے اپنی کلاہ سر سے اُتار کے بھیجی اور کہا کہ اس کو امیر کے سر پر رکھو۔ اُس کلاہ کے رکھنے سے اُس حالت سے افاقہ ہو گیا اور استغراقی کیفیت میں جو شدت تھی وہ جاتی رہی۔ امیر کو اس کیفیت کے جانے کا صدمہ ہوا کیونکہ اس میں لذت ہی اور تھی۔ اپنے پیر سے اس بارے میں عرض کیا۔ پیر نے فرمایا کہ تمہارا لطف جاتا نہیں ہے، اس وقت مصلحت ایسی ہی تھی آئندہ یہ کیفیت پھر عود کر آئے گی، چنانچہ آخر وقت میں شیخ کے ارشاد کا ظہور اچھی طرح دیکھا گیا۔

لذت سماع کی اس قدر تھی کہ جہاں کسی خوش گلو کو کچھ پڑھتے سن لیتے تھے بے اختیار ہو جاتے تھے۔ نعتیہ کلام اکثر لحن کے ساتھ پڑھواتے تھے اور بجائے خود وجد کرتے تھے۔

حفاظ و قرأء کے پڑھنے پر خاص کیفیت ہوتی تھی کہ بیان میں نہیں آسکتی جو حافظ مل جاتا تھا اُس سے فرمائش قرآن سنانے کی ہوتی تھی اور سفر و حضر میں ہر جگہ ہمیشہ یہی معمول رہا اور یہ لذت اُن کی روحانی قوت کا نتیجہ تھی۔

حصول سلوک کے اثناء میں ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ اُن کی قوت خیالی بہت بڑی ہوئی تھی یعنی جس بات کا تصور جزم کے ساتھ کر لیتے تھے اُس کا ظہور فوراً ہو جاتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ گھر میں بہت عسرت تھی جو درویشی کی خاص شان ہے۔

اُس زمانے میں کبھی کبھی اُن کی والدہ کہتی تھیں کہ امیر آج نہایت تنگی ہے۔ یہ کہتے فلاں طاق پر روپے رکھے ہیں۔ وہ اس طاق سے روپے لے لیتی تھیں۔ یہ واقعہ میں نے اُن کی زبان سے سنا ہے۔

آپ کا سلسلۂ طریقت حضرت خواجہ بزرگ تک اس طرح پہنچتا ہے کہ امیر مینائی مرید اور خلیفہ میاں امیر شاہ چشتی صابری کے ہیں اور وہ خلیفہ غلام شاہ کے ہیں اور وہ شاہ عبدالکریم کے اور وہ شیخ عنایت جی کے اور وہ حضرت شاہ بھیک کے اور وہ شاہ ابوالعالی کے اور وہ شیخ داؤد کے اور وہ شیخ محمد صادق کے اور وہ شاہ ابوسعید کے اور وہ شیخ نظام الدین بلخی کے اور وہ شیخ جلال الدین تہانیسری کے اور وہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے اور وہ شیخ محمد جی کے اور وہ شیخ عارف جی کے اور وہ حضرت شیخ احمد عبدالحق رُدولوی کے اور وہ شیخ جلال الدین کے اور وہ شیخ شمس الدین ترک پانی پتی کے اور وہ حضرت شیخ علاء الدین علی احمد صابر کے اور وہ بابا فرید گنج شکر کے اور وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے اور وہ خلیفہ غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے ہیں۔

شاعری:

قدرت نے یہ طے کر دیا تھا کہ ہونہار اور فاضل اجل امیر ایک زمانے میں ملک سخن کے بادشاہ ہوں گے اور امیر الشعرا کہلائیں گے اس لیے امیر کی طبیعت بہت کم سنی سے ہی شعر و سخن کی طرف مائل تھی ان کا زمانہ طالب علمی بھی شعر گوئی

www.urduacademyts.com

سے خالی نہ تھا اور اگر چہ انہوں نے ظاہر طور پر اشعار نہیں کہے لیکن اندر ہی اندر وہ شاعری کے مزے لے رہے تھے۔

علوم عربیہ کی تکمیل کے اثنا میں انہوں نے علم معانی و بیان اور ادب کی تحصیل اور اُس کے نکات کے حل کرنے اور موشگافیاں کرنے میں زیادہ نام پایا۔ علم ادب کے استاد مولوی تراب علی صاحب کہتے تھے کہ ادب کا امیرؔ ماہر کامل ہے' کچھ شک نہیں کہ شاعر کی طبیعت قدرت الٰہی کا مظہر ہوتی ہے اور اُس پر انور قدس کے تجلیات روشن ہو کر ایک خاص قسم کا سوز وگداز پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے جذبات باطنی کا اظہار شعر گوئی کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پھر اُس پر طرہ یہ کہ لکھنؤ کی آب وگل میں مذاق سخن پڑا ہوا تھا۔ عہد شاہی میں شاعری بھی ہر دلعزیز اور اوج کمال پر تھی اور نظم میں دریا بہانے والے چاروں طرف نظر آتے تھے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ کو یکساں مذاق تھا اور بادشاہ سے لے کر معمولی شخص تک شعر گوئی کا والہ وشیدا تھا۔ مزید براں حکومت کی قدر دانی اور سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی اور اسیرؔ۔ وزیرؔ۔ انیسؔ دوبیرؔ وغیرہ کی موجودگی نے شاعری کے جسم میں تازہ روح پھونک دی تھی۔ خود امیرؔ مرحوم کے والد اور بھائی شعر کہتے تھے۔ ایسی حالت میں امیر کا اس کم عمری میں شعر کہنا کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔

اگر چہ امیر پوشیدہ طور پر ابتدا میں شعر کہتے تھے اور کسی کو سناتے نہ تھے لیکن یہ بات پوشیدہ کیونکر رہ سکتی تھی۔ شدہ شدہ ان کے والد ماجد کو خبر ہوگئی۔ چنانچہ ایک رات جب کہ گرمیوں کا زمانہ تھا اور چاندنی کھلی ہوئی تھی اُن کے پیرانہ سال والد عشاء کی نماز پڑھ کر جانماز پر لیٹ گئے۔ سعادتمند بیٹا پاؤں دبا رہا تھا۔ والد نے شفقت سے پوچھا کہ میاں امیرؔ میں نے سنا ہے کہ تم شعر کہتے ہو۔ میں بھی تو سنوں کہ کیسے شعر کہتے ہو۔ امیرؔ نے شرم سے انکار کیا مگر ادھر سے اصرار ہوا۔ بالاخر بصد ادب یہ شعر پڑھا۔ اس وقت آپ کی عمر نو برس کی تھی:

ابر آتا ہے ہر بار برستا نہیں پانی
اِس غم سے مرے آنسوؤں کی ہے یہ روانی

والد بزرگوار ہونہار بیٹے کی طباعی کا اندازہ کر کے دل میں تو ضرور خوش ہوئے ہونگے مگر بہت دیر تک نصیحت کرتے رہے کہ بیٹا ابھی پڑھنے لکھنے کا وقت ہے' علم وفضل حاصل کرو تا کہ خاندان کی عظمت قائم رہے۔ بعد فراغ تحصیل جب جی چاہے شعر کہہ لینا۔ سعادتمند بیٹے نے سکوت اختیار کیا مگر فطرتی جوش کہیں روکے سے رک سکتا ہے۔ زمانہ تحصیل علم ہی میں اُنھوں نے اس فن میں بڑی حد تک ترقی حاصل کی اور اس قدرتی ذوق کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک طرف تو امیرؔ مرحوم تحصیل علم میں مصروف تھے' دوسری طرف شعر گوئی کا مشغلہ ترقی استعداد کے ساتھ بڑھتا گیا۔ مولوی تفضّل حسین فتح پوری کے مشاعروں میں آزادی کے ساتھ شریک ہونے لگے۔ مشاعروں میں امیر کے کلام نے بڑا نام پایا اور ہر دلعزیزی حاصل کی۔ اس مشاعرہ میں اکثر ذی استعداد اور کاملین فن شریک ہوا کرتے تھے درحقیقت امیرؔ مرحوم کی شاعری کی ترقی کا آغاز نہیں سے ہوا اور ان کے اشعار کی

www.urduacademyts.com

چاروں طرف سے تعریفیں ہونے لگیں اور بیس پچیس شاعر اُن سے کلام میں اصلاح لینے لگے۔ آپ نے اپنا تخلص اپنے نام کے ایک جز کو کیا تھا جن کو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیؔر
یہ بڑا حسن خدا داد مرے نام میں ہے

ایک غزل کے مقطع میں حضرت نے اپنا پورا نام نظم کیا ہے:

پیاس اس کی جو بجھے گی تو مئے کوثر سے
ظرف عالی ہے امیر احمد مینائی کا

ایک اور شعر میں بطور مسبح کے اپنا نام موزوں فرمایا ہے:

اے امیر احمد مرسل کے جو ہیں چار وزیر
چار یاری ہوں مجھے ہیں یہ برابر چاروں

امیؔر کی یہ خداداد ذہانت اور فطری موزونیت تھی کہ وہ اس وقت تک بغیر کسی استاد سے اصلاح لئے مشاعرے میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اب تک انہوں نے کوئی استاد منتخب نہ کیا تھا لیکن شوق ترقی سخن نے انہیں ترغیب دلائی کہ کسی استاد سے اصلاح کلام کی درخواست کرنا چاہیے۔ چنانچہ مدیر الدولہ مدیر الملک سید مظفر علی خاں بہادر اسیؔر کے سامنے اپنا کلام اصلاح کیلئے پیش کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امیؔر نے استاد کا کلام اور اُن کی قابلیت اور اُن کی طریق اصلاح کو دیکھ کر اپنی استادی کے لئے انہیں منتخب کیا تھا۔ جیسے جیسے وہ اپنے کلام میں اصلاح لیتے گئے یہ انتخاب قابل قدر ثابت ہوتا گیا۔

حضرت اسیؔر نے ہونہار شاگرد کی طرف نہایت توجہ کی اور ان کی ذہانت اور طباعی کے گرویدہ ہوکر بزرگانہ شفقت کے ساتھ اصلاح دینے لگے۔ جب اسیؔر سا قابل شاگرد ملے اور حضرت اسیر سا استاد جو مراتب تحقیق میں کمال رکھتا ہو تو شاگرد کے کلام میں استاد کی اصلاح ایسی ہوتی ہے جیسے سرو وصنوبر کی پیرائش کے لئے باغباں کی والانظری یا چمن شاداب کی نشو ونما کے واسطے ابر بہاری کا ترشح یا آئینے کی جلا کے لئے صیقل چنانچہ روز بروز کلام میں فرق نظر آنے لگا۔ پہلی غزل جو استاد کے سامنے بغرض اصلاح پیش کی گئی، اس کا مطلع یہ ہے:

دل میں اپنے جب خیال زلف مہماں ہوگیا
آنکھ میں خوابِ پریشاں سنبلستاں ہوگیا

امیر مرحوم بیان کرتے تھے کہ جناب اسیؔر نے غزل دیکھ کر فرمایا سب شعر اچھے ہیں، اصلاح کی حاجت نہیں۔ مجھے اُن کے فرمانے سے بجائے خود یہ گمان ہوا کہ ان اشعار میں تصرف کی گنجائش نہیں ہے، مگر اس پر بھی میں نے استاد سے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ اس میں اصلاح دیں۔ وہ میرے خیال کو سمجھ گئے اور اکثر شعروں میں ایسا تصرف کیا جس کی امید مجھے ہرگز نہ تھی

☆☆☆

www.urduacademyts.com

مخدوم محی الدین ۔حیات اور شخصیت

خاندان:

مخدوم محی الدین ایک مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔موضع منمول میں اس گھر کے افراد نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔اس گاؤں میں یہی تعلیم یافتہ گھرانہ سمجھا جاتا تھا۔گاؤں کے بچے یہیں اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ گھر ''حضرت کا گھر'' کہلاتا تھا۔اس خاندان کے باعث احترام ہونے کا ایک یہ سبب بھی تھا کہ اس کا سلسلہ نسب حضرت خواجہ ابوسعید خدری سے جاملتا ہے جو رسول اکرم صلعم کے صحابی تھے۔

مخدوم کے جداعلیٰ مولوی رشیدالدین اور سید جعفر علی، بالترتیب اورنگ زیب کی فوج کے ہمراہ براہِ آعظم گڑھ دکن کا رخ کیا اور ثانی الذکر براہ شاہجہان آباد ۱۸۵۷ء میں واردِ دکن ہوئے تھے۔

مخدوم کے پر دادا مولوی محمد مخدوم الدین موضع منمول میں سو برس پیشتر فردکش تھے۔مولوی محمد مخدوم الدین ایک خداترس اور سخت مذہبی انسان تھے۔کاشت کاری ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد نے سرکاری نوکری کو زیادہ اہم جانا۔ چنانچہ مخدوم کے دادا محمد احسن الدین سر رشتہ مال ضلع میدک میں میر منشی کی خدمت پر کچھ عرصہ تک مامور رہے لیکن بعد کو عہدہ داران سر رشتہ سے درخواست کر کے اپنے بیٹے محمد غوث محی الدین (مخدوم کے والد) کو قائم مقام بنادیا، چنانچہ محمد غوث محی الدین بحیثیت اہلکار تحصیل اندول کارگزار رہے۔

ولادت:

مخدوم کا پورا نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین خدری تھا۔خاندان کے بزرگ انھیں ''بابا'' کی عرفیت سے پکارتے تھے۔مخدوم کا آبائی وطن منمول تھا۔

مخدوم بتاریخ ۴؍فروری ۱۹۰۸ء (مطابق یکم محرم الحرام ۱۳۲۶ھ، ۲؍فروری ۱۳۲۷ف) شب سہ شنبہ بہ وقت ۱۱ ساعت شب، اندول ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد ملازم تھے۔

گھریلو ماحول:

مخدوم ابھی پانچ برس دو ماہ کے تھے، ان کے والد محمد غوث محی الدین، اپریل ۱۹۱۳ء بمقام اندول انتقال کر گئے۔ وہیں مقبرۂ بایزید شہید کے احاطے میں مدفون ہوئے۔محمد غوث محی الدین نہایت بذلہ سنج، خوش مزاج انسان تھے۔خاندان کا ہر فرد ان کی صحبت سے حظ اٹھاتا تھا۔مخدوم کے چچا محمد بشیر الدین اپنے بھائی کی جائیداد (اسامی) پر فائز کیے گئے۔ان کا

www.urduacademyts.com

تقرر تحصیل اندول پر بہ حیثیت اہلکار عمل میں آیا۔ (محمد بشیر الدین اپنے بھائی کے ساتھ ہی رہتے تھے اور تحصیل اندول کے امید واروں میں تھے' اب مخدوم اپنے چچا کے زیر پرورش آ گئے۔ مذہبی ماحول کے باعث مخدوم بچپن ہی سے نماز اور روزہ کے پابند ہو گئے۔ کنویں سے پانی سینچنا' مسجد کی باجماعت حاضری' جاروب کشی' اذان دینے کے فرائض ان کے روزمرہ میں داخل تھے۔ گھر پر قرآن شریف ختم کیا اور مدرسوں میں دینیات کی تعلیم پائی۔

ابتدائی تعلیم:

مخدوم کے چچا محمد بشیر الدین اپنی ملازمت کے سلسلے میں مختلف اضلاع پر کارگزار رہے۔ اس طرح مخدوم کی تعلیم بھی مختلف مدارس میں ہوئی۔ اندول' سنگاریڈی' میدک' پٹن چرو کے مدارس مخدوم کے کسب علم کے مراکز رہے۔ پرائمری اسکول' مڈل اسکول سنگاریڈی' دھرم ونت ہائی اسکول (یاقوت پورہ) حیدرآباد اور ہائی اسکول میدک میں مخدوم کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۲۹ء میں سنگاریڈی (ضلع میدک) ہائی اسکول میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چیلہ پورہ کے مدرسۂ شبینہ سے منشی کے امتحان میں بھی امتیازی کامیابی حاصل کی۔

جامعہ عثمانیہ میں داخلہ:

مخدوم جن اقتصادی حالات سے دوچار تھے وہاں آگے تعلیم حاصل کرنے کا خیال ہی کارمحال نظر آتا ہے۔ بہ ایں ہمہ انھوں نے ۱۹۲۹ء میں جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لے لیا۔ جامعہ ان کے لیے تعلیم گاہ تو تھی ہی لیکن تفریح گاہ بھی تھی۔ شرارت' لطیفے' چٹکلے' چھیڑ چھاڑ سے انھیں اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ صف اول کے طالب علم کہلاتے۔

منظر احسن گیلانی دینیات کے پروفیسر تھے جن سے وہ (محض ستانے کی خاطر ایسے سوالات کرتے کہ گیلانی صاحب عاجز آجاتے۔ بات یہاں تک بڑھی کہ انھیں دینیات میں ناکام کر دیا گیا اور حاضری بھی اتنی کم کہ امتحان میں بیٹھنے کی اجازت تک نہ مل سکی۔

اپنی تمام تر مشکلات اور شرارتوں کے باوجود مخدوم نے ۱۹۳۴ء میں بی اے کا امتحان درجہ دوم میں کامیاب کیا اور ۱۹۳۶ء میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

جامعہ عثمانیہ نے مخدوم کو ان شخصیتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع عطا کیا۔ ''وے جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں''

مثلاً ڈاکٹر عبدالحق' پروفیسر وحیدالدین سلیم' ڈاکٹر سید عبداللطیف' ای۔ای۔اسپیٹ' عبدالقدیر صدیقی' عبدالواسع صفا' مناظر احسن گیلانی' سید اشرف شمسی' پروفیسر حسین علی خاں' پروفیسر ہارون خاں شروانی' ڈاکٹر یوسف حسین خاں' خلیفہ عبدالحکیم' محمد الیاس برنی' ڈاکٹر زور' پروفیسر عبدالقادر سروری وغیرہ۔

مخدوم جامعہ میں بحیثیت شاعر خاصے مقبول تھے

www.urduacademyts.com

ان کے معاصر شعراء جو فرزندان جامعہ تھے ان میں سکندر علی وجدؔ، محمد علی خاں میکش، صمد رضوی ساز، علی حسنین زیبا، اکبر وفا قانی، ڈاکٹر بدر الدین بدر، جلال الدین اشک، عبدالقیوم خان باقی، محمد امیر، مہندر راج سکسینہ، ڈاکٹر رگھونندن سکسینہ، شنکر موہن رواں وغیرہ جامعہ کی فضائے شعر و سخن کو معطر و گرم رکھتے تھے۔

شعرائے جامعہ عثمانیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مخدوم کے بارے میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے لکھا ہے:

''مخدوم ایک وارفتہ اور بے باک شاعر ہے۔ کمیونسٹ تحریک کا دلدادہ اور ترقی پسندی کا علم بردار عرصے سے وہ اور ان کی شاعری دونوں روپوش ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''سرخ سویرا'' جدید اردو شاعری کی شاہکار اور متعدد نوجوان شعرا کے لیے نمونہ کا کام انجام دے رہا ہے۔''

شادی:

مخدوم کی شادی ۲۲؍اگست ۱۹۳۳ء بروز پنجشنبہ (مطابق ۲؍ جمادی الاول ۵۲ھ ۸۱؍ مہر ۱۳۴۲ ف) ان کی چچازاد بہن رابعہ بیگم سے محلّہ الاوہ بی بی میں انجام پائی۔ قدیم حیدرآباد میں صبح کے عقد کا رواج تھا، کھانا لازمی تھا اور رقعوں پر تحریر ہوتا تھا ''از صبح تا نصف النہار'' تمام مہمانوں کی ضیافت طعام ہوا کرتی تھی۔ اگر چہ یہ دن تعطیل کا دن نہیں تھا لیکن احباب و اعزا کی کثیر تعداد دن بھر گھر پر جمی رہی۔ اس شادی کے تعلق سے مخدوم کے رفیق دیرینہ مرزا ظفر الحسن نے یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے:

''مسلسل دو روز سے کچھ کھایا نہ تھا (مخدوم)، یوں ہی اپنے رشتے کے چچا سمیع الدین کے گھر گئے، جہاں دختر خانہ نے مخدوم کو نحیف و نزار پایا، کھانے کے لیے پوچھا تو دو دن کا فاقہ زدہ کس بھرتے پر انکار کرتا۔ اس نے جلدی جلدی روٹیاں پکائیں، دستر خوان بچھایا اور کھانا پیش کیا۔ بعد کو وہی دختر نیک اختر جس کا نام نامی رابعہ ہے مخدوم کی رفیقہ حیات بنی''۔

اولاد:

مخدوم کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ذکیہ بیگم ۲۔ محمد سعید الدین ۳۔ رفیعہ بیگم ۴۔ نصرت محی الدین ۵۔ ظفر محی الدین۔ مخدوم نے پیار سے ذکیہ کو ''اساوری'' اور رفیعہ کو ''لیتا'' کے نام دے رکھے تھے۔ ان پانچ اولادوں میں سے دو چل بسیں۔ محمد سعید الدین ۹؍نومبر ۱۹۳۷ء (مطابق ۵؍دے ۱۳۴۷ ف) کو پیدا ہوئے اور آٹھ ماہ بیس دن بعد یعنی (۳؍ جولائی ۱۹۳۸ء مطابق ۲۵ شہریور ۱۳۷۴ ف) کو انتقال کر گئے۔ اسی طرح رفیعہ بیگم ۴؍ جولائی ۱۹۴۰ء (مطابق ۲۹؍ امرداد ۱۳۴۹ ف) کو پیدا ہوئیں اور دو سال سات ماہ دس دن بعد ۱۳؍فروری ۱۹۴۳ء (مطابق ۱۱؍فروری ۱۲۵۲ ف) کو چل بسیں۔

چچا باوا:

ذکیہ بی بی اساوری لکھتی ہیں:

www.urduacademyts.com

''اپنے والد محترم کو ''ابا'' یا ''پپا'' کہنے کے بجائے ہم انھیں چچا باوا کیوں کہا کرتے تھے؟ یہ سوال بلاشبہ غور طلب ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اور میرے چھوٹے بھائی نصرت محی الدین نے ''نظام صاحب'' کے جس حیدرآباد میں آنکھیں کھولیں اس میں مخدوم، شاہی اور مطلق العنانی کے سب سے بڑے دشمن سمجھے جاتے تھے۔ میری زندگی کا بہت بڑا حصہ تو کچھ ایسا گزرا کہ میں اپنے والد محترم کو جورو پوشی کی زندگی گزار رہے تھے، مہینوں میں ایک مرتبہ ان کے کسی قریبی دوست کے گھر پر دیکھ لیا کرتی تھی، جہاں وہ پارٹی کے کسی کام کے سلسلے میں آتے اور لگے ہاتھوں ہم سے بھی مل لیتے۔ اس پرآشوب دور میں ہم سب اپنے چچا محترم نظام الدین صاحب کے گھر رہا کرتے تھے جو سرکاری ملازم تھے اور محض مخدوم صاحب کے بھائی ہونے پر حکومت کی نظروں میں کھٹکا کرتے تھے۔ اس اندیشے سے ہمیں بھی ان کی اولاد ہونے کے ناطے کہیں عتاب شاہی کا شکار نہ ہونا پڑے ہمارے بزرگوں نے بچپن ہی میں یہ باور کرادیا تھا کہ مخدوم صاحب ہمارے چچا ہیں۔

معمولات:

مخدوم سحر خیز تھے۔ بستر سے اٹھتے ہی سادہ چائے (بلیک ٹی) لیمو کے چند قطرے نچوڑ کر پیتے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہوکر شیو بنانا اور نہانا ان کا معمول تھا۔ سیدھے سادے صاف ستھرے کپڑے (اکثر بشرٹ، پینٹ) پہن کر جلد ہی گھر سے نکل پڑتے تھے۔ اگر کسی کو وقت دے رکھا ہو تو گھڑی پر نگاہ رہتی۔ اگر ملنے والا وقت پر آجائے تو فبیہا ورنہ وہ اپنا وقت خراب نہیں کرتے تھے۔ وقت کی اس قدر پابندی ہمارے ملک میں شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے، جہاں جانا ہو قطعی وقت پر پہنچتے۔ حتی کہ مشاعروں میں بھی وقت پر پہنچ جاتے تھے جب کہ عام طور مشاعرے گھنٹہ آدھا گھنٹہ تاخیر سے شروع ہوتے ہیں۔ وہ اپنی غافل قوم کی حالت پر کڑھتے اور ترس کھاتے ضرور تھے لیکن انھوں نے اپنی وقت کی پابندی تاحیات نبھائی۔

گھریلو زندگی:

مخدوم کی گھریلو زندگی سیدھی سادی، قانع، مطمئن اور آسودہ ان معنوں میں کہ وہ لمحۂ نقد کو خوشی کے ٹکسال میں بھنانے کے فن سے واقف تھے۔ وہ زندگی سے آخر وقت تک کبھی شاکی نہیں رہے۔ ان کی نجی پریشانیاں کچھ کم نہ تھیں لیکن وہ ان سے رنجیدہ نہیں تھے بلکہ خوش اس بات پر رہتے تھے کہ خلقی طور پر انہیں خوش رہنے کی توفیق عطا ہوئی تھی۔

بچپن تتلیوں کے تعاقب میں گزرنے کی بجائے اس تلاش میں گزر گیا کہ باغ کہاں ہوتے ہیں اور تتلیاں کہاں ملتی ہیں۔ جوانی ''عیش بافراغت کے مزے'' اٹھانے کے بجائے ''چکی کی مشقت'' میں گزری۔ میں نے جو دور دیکھا تھا وہاں بھی ایک رکھ رکھاؤ کے سوا کچھ نہ تھا وہی حال ان کا بھی تھا جو شریف النفس خوش پوشوں کا ہوتا ہے۔

مخدوم کے نجی خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں گھر والوں کا کس قدر خیال تھا۔ ذیل میں نصرت کے نام لکھے

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

ہوئے چند خطوں کے اقتباسات سے اندازہ ممکن ہے۔

لومبا نگر۔ وجئے واڑہ۔

۸/اپریل ۶۱ء

ڈیر نصرت دعا.....

لاہوٹی صاحب نے پیسے دیے ہوں گے ۔ تین جوڑ چپلوں کی بھی ملی ہوگی۔ ایک تمہاری ممی کی ایک بی بی اور ایک صفیہ کے لئے ۔ میرے پاس ناپ نہیں تھا۔ یوں ہی اندازے سے لیے ہیں۔ معلوم نہیں پورے اترتے ہیں کہ نہیں.....

دل لگا کر پڑھو۔

تمہارا.....مخدوم

حیدرآباد

یکم ستمبر ۶۸ء

ڈیر نصرت۔ پیار

ڈیر نصرت۔ خط ملا۔ تمہاری پریشانیوں کا حال معلوم ہوا۔ ایک دو دن میں پیسے تمہیں منی آرڈر کے ذریعہ سے مل جائیں گے۔ اندارا بھیج رہی ہیں۔ میں آج جارہا ہوں دلی۔ تمہاری امی یہیں ہیں۔ نصیرہ کی والدہ کا آپریشن تھا۔ وہ بھی اپنے گھر آگئی ہیں۔ بی بی بھی گھر آگئی ہیں، بچہ اور وہ روبہ صحت ہیں۔

میں ۸/ستمبر کو واپس آجاؤں گا۔ کام ہوجانے کے بعد وقت ہو تو ایک آدھ دن کے لیے یہاں آجاؤ۔ اس رقم میں تم اپنے خرچ کے لیے کچھ لے لو۔ دلی سے آنے کے بعد کچھ بھیجنے کی کوشش کروں گا.....

مخدوم

رام چندر پورم

۱۹/اگست ۶۸ء

ڈیر نصرت پیار۔ ۱۷/اگست ۶ بجے شام بی بی کی زچگی ہوئی، بچہ پیدا ہوا۔ آپریشن کرنا پڑا۔ بچہ بھی اچھا ہے۔ گو وزن کم ہے۔ تمہاری امی یہیں ہیں۔ آج نصیرہ، زلفیہ، الیاس، ظفر اور منی بھی یہیں ہیں .....جیسے بھی سہی کام پورا کرلو۔ یقیناً آئندہ تمہارا یہ قیمتی تجربہ بہت کام آئے گا۔ حساب اچھا رکھو اور اخراجات میں کفایت سے کام لو، ورنہ آیندہ کام میں بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ دوسرے کاشت کاروں سے تعلقات اچھے رکھو۔ پانی پر یا کسی اور بات پر قضیے پیدا ہوسکتے ہیں۔ اس لیے دانش مندی اور صلح سے کام نکالا جائے.....

سب کو سلام

تمہارا

مخدوم

☆☆☆

اُردو ہماری مادری زبان ہے
اس میں آپ کی تہذیب ہے
اس کی حفاظت کیجئے
اپنے نونہالوں کو اس زبان سے واقف کرایئے
اپنے ورثہ کو بچایئے۔

www.urduacademyts.com

اے۔ایس۔بی

''زیڈ۔اے۔بی'' کے بڑے بھائی کو ہم لوگ ''اے۔ایس۔بی'' ہی کہا کرتے تھے ورنہ محض بخاری صاحب کہنے میں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کون سے بخاری صاحب، بڑے یا چھوٹے؟ اور پورا نام لینے میں یعنی احمد شاہ بخاری اور ذوالفقار علی بخاری کہنے میں کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اتنی سی تو عمر ہے اتنے بڑے بڑے نام لے کر اس کی خواہ مخواہ فضول خرچی کیوں کی جائے۔لہذا ریڈیو والے عموماً ان دونوں بھائیوں کو اے ایس بی اور زیڈ اے بی ہی کہنے میں کفایت شعاری کے زریں اصول پر عمل کیا کرتے تھے۔۔۔

لیکن یہ میں نے بیچ دھڑے سے ریڈیو کی بات کہاں شروع کردی۔ریڈیو سے تو میرا تعلق اس وقت پیدا ہوا ہے جو آل انڈیا ریڈیو کا لکھنو اسٹیشن قائم کیا گیا ہے اور میں اے۔ایس۔بی سے بحیثیت پطرس کے اس سے پہلے ہی مل چکا تھا۔یعنی اس وقت جو میں لکھنؤ سے بحیثیت ''ٹاکر'' تقریباً ہر ہفتہ آل انڈیا ریڈیو دہلی جایا کرتا تھا اور تاکے بیٹھا تھا کہ پطرس سے ملاقات ہوتے ہی ان کو بھی اسی طرح پھانس لوں گا جس طرح مولانا نیاز فتحپوری، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی کو پھانس چکا ہوں۔اپنے ایک مجموعہ مضامین پر مولانا نیاز فتح پوری سے مقدمہ لکھوا چکا تھا۔اس مجموعے کا نام ''بحر تبسم'' تھا۔دوسرے مجموعہ ''سیلاب تبسم'' پر مرزا عظیم بیگ چغتائی سے مقدمہ لکھوایا تھا۔تیسرے مجموعہ ''طوفان تبسم'' پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے مقدمہ لکھا تھا۔ چوتھے مجموعہ ''دنیائے تبسم'' پر رشید احمد صدیقی کا مقدمہ تھا اور اب ایک اور مجموعہ پر مقدمہ لکھنے کو پطرس بخاری پر نشانہ باندھ چکا تھا۔چنانچہ ایک مرتبہ جو اپنی تقریر نشر کرنے دہلی گیا تو اس نئے مجموعے سے مسلح ہو کر گیا اور بخاری صاحب کو ان کے دفتر میں جالیا۔بڑے خلوص سے ملے بلکہ مجھ کو کچھ شبہ سا ہونے لگا کہ میں ان سے پہلی مرتبہ نہیں مل رہا ہوں، یعنی ان سے مرعوب ہونا چاہتا اور وہ اس کا موقع ہی نہ دیتے تھے۔ہر چند کہ وہ جس وقت ڈپٹی کنٹرولر براڈ کاسٹنگ کی کرسی پر بیٹھے تھے، مگر مجھ کو اس سے کیا میں تو ایک عظیم مزاح نگار کے سامنے ان کے ایک عقیدت مند کی حیثیت سے حاضر تھا اور ان کی عظمت کا احساس مجھ پر طاری تھا۔جس کو وہ اپنے انتہائی یگانگت اور مساوات کے برتاؤ سے غیر محسوس بنائے دیتے تھے۔آخر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں حرف مطلب زبان پر لایا اور بخاری صاحب سے اپنے نئے مجموعہ مضامین پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی تو بڑی خندہ پیشانی سے بولے،

''یہ کیا مقدمہ بازی لے بیٹھے آپ؟''

میں نے عرض کیا، ''جی ہاں یہ چھوٹا منہ بڑی بات ضرور ہے مگر میں آپ سے وعدہ لیے بغیر ٹلنے والا نہیں ہوں۔''

کچھ ہنستی ہوئی آنکھوں سے گھورا۔کچھ سر پر ہاتھ پھیرا اور گویا عاجز آ کر مسکراتے ہوئے بولے، ''اگر آپ اپنے

www.urduacademyts.com

مقدمہ نگاروں کی ٹیم ہی مکمل کرنا چاہتے ہیں تو بہتر ہے لکھ دوں گا مقدمہ۔''

وہ وعدہ لے کر میں بڑے فاتحانہ انداز سے واپس آیا۔ مگر اس ملاقات کے بعد ہی حالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو نے لکھنو میں بھی اپنا اسٹیشن کھول دیا اور اس اسٹیشن کے ڈائریکٹر جگل کشور مہر اور پروگرام ڈائریکٹر ملک حسیب احمد نے اپنے محکمہ کو نجانے کیا پٹی پڑھائی کہ مجھ کو بھی صحافت چھوڑ کر ریڈیو سے وابستہ ہو جانا پڑا۔ اور اس کے چند ہی دن بعد میرا وہ مسودہ جو میں بخاری صاحب کے پاس چھوڑ آیا تھا مجھ کو ان کے اس خط کے ساتھ واپس مل گیا کہ ''اب جو کہ آپ کو ریڈیو میں ایک منصب حاصل ہو چکا ہے عافیت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ مجھ سے مقدمہ نہ لکھوائیں اور میں مقدمہ نہ لکھوں۔'' بات بھی ٹھیک تھی لہذا یہ ارمان دل کا دل ہی میں رہ گیا اور بقول بخاری صاحب کے میری مقدمہ نگاروں کی ٹیم مکمل نہ ہو سکی۔

اب بخاری صاحب محکمہ کے افسر اعلیٰ تھے اور میں محکمہ کا ایک ادنیٰ کارپرداز۔ لہذا جب وہ لکھنؤ اسٹیشن معائنہ کے لئے تشریف لائے تو میں نے ان سے دانستہ کترانے کی کوشش کی، مگر خود انہوں نے عمداً گھیر گھیر کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ وہ اس توجہ سے کام لیتے رہے۔ مگر مجھ کو اپنے حدود کا اندازہ تھا اور میں ان حدود سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ کچھ دن کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ بخاری صاحب کے جس سلوک کو میں اپنے ساتھ خصوصیت سمجھتا تھا وہ ہر ایک کے لئے عام تھا اور ان کا طریقہ ہی یہ تھا کہ سرکاری اور محکمہ جاتی کام کے وقت وہ نہایت بھاری بھرکم قسم کے افسر بنے رہتے تھے اور کام ختم ہوتے ہی نجی صحبتوں میں ان ہی سب کے بے تکلف دوست بن جایا کرتے تھے جن پر تھوڑی دیر پہلے ان کا رعب قائم رہ چکا تھا۔ انھیں لطیفے سنا رہے ہیں، نئے لطیفے سنانے کی فرمائش کر رہے ہیں، بات سے بات پیدا کر رہے ہیں، ہنس رہے ہیں اور ہنسا رہے ہیں۔ ایک دن اسی قسم کی نجی صحبت میں ہنس بول رہے تھے کہ ایک بھولی بسری بات یاد کر کے ٹہلتے ہوئے میرے قریب آ کر سرگوشی کے انداز میں بولے:

''مجھ کو بری کرنے کے بعد آپ نے وہ مقدمہ کس پر دائر کیا؟''

میں نے کہا، ''کسی پر نہیں، وہ مجموعہ بغیر مقدمہ کے چھپ گیا۔''

کہنے لگے، ''اور میری یہ سزا بحال رہی کہ میں اسے نہ پڑھ سکوں۔''

میں کتاب پیش نہ کرنے پر ابھی پوری طرح نادم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا، ''آخر لوگ مقدمہ لکھواتے ہی کیوں ہیں۔ مجھے تو یہ حرکت کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی کسی کی انگلی پکڑ کر ٹہل رہا ہو بلکہ انگلی پکڑ کر میلہ دیکھنے گیا ہو۔''

میں نے اعتراف کیا کہ ''جی ہاں میں اس حماقت کو سمجھ چکا ہوں اور اب اس مقدمہ بازی کے چکر میں نہ پھنسوں گا۔''

بڑی سنجیدگی سے بولے، ''اللہ تعالیٰ آپ کو

www.urduacademyts.com

استقامت دے۔''

کچھ ہی دنوں بعد مجھ کو لاہور سے پنچولی آرٹ پکچرز والوں نے طلب کرلیا۔ اور میں نے ریڈیو سے علیحدگی کے وقت بخاری صاحب کو ایک الوداعی خط لکھا جس کا جواب مجھ کو فوراً مل گیا کہ:

''امتیاز (سید امتیاز علی تاج) کے بعد آپ کے بھی پنچولی آخر نکل ہی آئی، خداوند کریم آپ کو صحت کلی عطا فرمائے۔ آپ جارہے ہیں خدا حافظ۔ ریڈیو کے دروازے ہر وقت آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ دروازہ صرف جانے کے لئے نہیں آنے کے لئے بھی ہوتا ہے۔''

اور جب پنچولی آرٹ پکچرز سے گزیٹیڈ افسر بننے کے شوق میں سونگ پبلسٹی آفیسر ہوکر میں پھر لکھنو آ گیا تو بخاری صاحب ڈپٹی کنٹرولر نہیں بلکہ کنٹرولر براڈ کاسٹنگ کی حیثیت سے لکھنؤ کے دورے پر آئے اور مجھے خاص طور پر ملنے کے لئے بلا بھیجا۔ میں نے اپنی تازہ کتاب ''شیش محل'' پیش کی اور جب دوسرے دن ریڈیو والوں نے ان کے ساتھ ہی مجھ کو بھی لنچ پر مدعو کیا تو میری صورت دیکھتے ہی بولے:

''ساری رات شیش محل کی سیر کی ہے، نشہ ابھی تک باقی ہے۔ کیسے کیسے بھر پور مصرعے کہے ہیں جابجا۔۔۔ ہزاروں سلام پہنچیں اس خاتون مشرق کو جو احسان کے بچوں کی ماں تک ہے۔ احسان کی رفیقہ حیات ہونا تو درکنار۔۔۔ اور وہ افسر میرٹھی کے لئے کیا لکھا ہے کہ بچپن سے ان کو دیکھ رہے ہیں مگر اب بھی آپ ہمارے برابر ہی نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ ریفریجریٹر میں بیٹھ کر عمر کو ایک جگہ قائم رکھتے ہیں یا مصری ممی لگانے والا مسالہ اپنے زندہ جسم پر لگا لیتے ہیں۔''

اور مجھ کو اس تبصرے سے زیادہ خوشی اس کتاب کی رائلٹی وصول کرتے وقت بھی نہ ہوئی تھی اتنے بڑے مزاح نگار کی یہ سند میرے اترانے کے لئے بہت کافی تھی۔

سونگ پبلسٹی کے محکمہ میں چار پانچ سال تک گانے بجانے کی گزیٹیڈ افسری کر کے میں پھر اپنی اوقات پر آ گیا اور پنچولی آرٹ پکچرز سے پھر وابستہ ہوگیا۔ اگر ۱۹۴۷ء ہی میں جب قیام پاکستان کے بعد پنچولی صاحب بمبئی سدھارے اور ریڈیو پاکستان کی داغ بیل پڑی تو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل چھوٹے بخاری یعنی سید ذوالفقار علی بخاری نے مجھ کو پروانہ تقرر دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ فیصلہ آپ خود کیجئے کہ یہاں آپ کیا کریں گے۔ اپنے لئے کام خود پیدا کیجئے۔'' چنانچہ میں اپنے لئے کام پیدا کرنے میں اس طرح مصروف ہوگیا کہ اپنے کو بحیثیت قاضی جی کے پیدا کرنا شروع کردیا۔ اے۔ ایس۔ بی۔ ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کے عہدے سے اپنے آپ کو سبکدوش کرا کے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے دہلی سے لاہور آ چکے تھے۔ اور اب ان کے بنگلے پر شام کی نشستیں ہوا کرتی تھی۔ جن میں ڈاکٹر تاثیر، مولانا سالک، صوفی تبسم معہ اپنے حقہ کے، جگل کشور مہرا جو مشرف بہ پاکستان ہو چکنے کے بعد مشرف بہ اسلام ہونے کے ارادے کر رہے تھے۔ سید رشید احمد، مولانا چراغ حسن حسرت اور سید امتیاز علی تاج کے ساتھ

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

رہتے تھے۔ جونہیں آتا تھا اس کو بخاری صاحب خود جا کر پکڑ لاتے تھے۔ جو آجاتے تھے ان کو رات گئے بلکہ کبھی کبھی صبح ہونے سے قبل اپنی کار پر گھر چھوڑنے جاتے تھے اور یہ نصیحت کرتے جاتے تھے کہ رات کو خواہ کہیں رہو مگر صبح اپنے بستر ہی سے اٹھو۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ رات کو تین بجے آئس کریم کھانے کا دورہ پڑا اور کوشش کی گئی کہ پگھلے ہوئے آئس کریم والوں کو جس طرح بھی ہو اسی وقت جمایا جائے اور حیرت ہے کہ اس وقت بھی ان کو کہیں نہ کہیں آئس کریم مل ہی گئی اور آئس کریم والے جمع جمائے ڈھونڈ ہی لئے کہیں نہ کہیں سے۔

ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹیشن ڈائریکٹر جگل کشور مہرا پاکستان کے زندہ باد ہونے کے بعد خود عجیب مردہ باد بن کر رہ گئے تھے، کہ بخاری، اردو اور لاہور کے محبت میں رہ تو پڑے پاکستان میں مگر نجانے کیوں ان کو اپنا جگل کشور مہرا ہونا پاکستان میں کچھ پیوند سا نظر آرہا تھا۔ بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے بخاری نے ان کو سمجھایا، دوسرے دوستوں نے بھی اس جلد بازی سے روکا مگر ہوا یہی کہ ایک دن چند مخصوص احباب کی موجودگی میں بخاری صاحب کے گورنمنٹ کالج والے بنگلہ میں وہ مولانا غلام مرشد کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہو کر کلمہ شہادت پڑھتے اور مولانا غلام مرشد سے اس کا تفصیلی بلکہ تفصیلی سے بھی کچھ زیادہ ترجمہ سمجھتے نظر آئے اور عین اس وقت جب وہ جگل کشور سے یکا یک احمد سلمان بن چکے تھے اسی جگہ ان کی ترقی کے احکام موصول ہوئے کہ وہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان مقرر کردئے گئے۔ اس کے بعد ہی دوسرا شرعی اجتماع خود احمد سلمان صاحب کی کوٹھی پر اس وقت ہوا جب ان کے نکاح کا مرحلہ درپیش تھا، اور محمود نظامی صاحب کے ذمہ تھا، قاضی کو بلانا جو تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوارا نثراد مولانا کو نہ جانے کہاں سے پکڑ لائے۔ بخاری نے ان مولانا کو بڑے غور سے دیکھا اور میرے کان میں کہا کہ ''نکاح کے لئے قاضی اور چھوارے دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ نظامی ان دونوں چیزوں کو ملا کر لے آیا ہے۔'' اس تقریب میں سید ذوالفقار علی بخاری دولہا کے ولی بنے اور میں دلہن کا ولی۔ ہم دونوں مہر کے تعین پر تھوڑا بہت لڑ جھگڑ کر آخر تصفیہ تک پہنچ ہی گئے۔ بخاری صاحب صرف تماشائی بنے بیٹھے رہے۔ چھوٹے بخاری وکیل بنے، گواہ میں بنا اور دوسرے گواہ محمود نظامی صاحب۔ اور جب دلہن سے پوچھ کر ہم لوگ قاضی صاحب کے پاس آگئے تو کچھ نہ پوچھئے کہ ان کو محض یہ سمجھانے میں کتنے لوہے لگے ہیں کہ دلہن کا نام سلمے نہیں بلکہ انور ہے اور دولہا کا نام انور نہیں بلکہ سلمان ہے۔ اس کے بعد بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ قاضی صاحب نے ان دونوں میں سے کس کو دولہا اور کس کو دلہن سمجھ کر نکاح پڑھایا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ نکاح ان ہی دونوں کا ہوا تھا اور غالباً یہ بات ان ہی دونوں پر چھوڑ دی گئی تھی کہ اپنا دولہا دلہن ہونا خود آپس میں طے کرتے رہیں۔ البتہ جو خطبہ بعد میں پڑھا ہے اس کے متعلق بخاری صاحب کا بیان یہ تھا کہ یہ خطبہ نکاح کا نہیں بلکہ جمعہ کا تھا۔ اس خطبے کے بعد بخاری نے دور سے ایک چھوارا ان مولوی صاحب کو دکھاتے ہوئے کہا، ''مولانا چھوارا'' اور مولانا نے اپنا پوپلا منہ چلاتے ہوئے کہا، ''جی بسم اللہ'' بخاری صاحب نے ''جزاک اللہ'' کہا اور چھوارا کھا گئے۔

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

اس کے بعد ہی یہ شیرازہ منتشر ہوگیا۔ ریڈیو پاکستان کا ہیڈکواٹر کراچی چلا گیا۔ چھوٹے بخاری صاحب معہ رشید احمد صاحب اور احمد سلمان صاحب کے کراچی چلے گئے۔ بڑے بخاری صاحب یو این او میں جا پہنچے، میں لاہور ہی میں رہ گیا۔ اس سناٹے میں اپنے کو الجھانے کے لئے کئی سال بعد کراچی میں اپوا کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ بخاری صاحب ان دنوں امریکہ سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ لہٰذا میں نے اس مشاعرے کی دعوت کو فوراً قبول کر لیا کہ کراچی میں بخاری صاحب سے ملاقاتیں رہیں گے۔ سلمان صاحب بھی وہیں ہیں، رشید صاحب اور چھوٹے بخاری صاحب بھی وہیں۔ ایک مرتبہ پھر کھلی صحبتیں گرم ہو جائیں گی اور کراچی پہنچ کر جب یہ معلوم ہوا کہ اس مشاعرے کی صدارت بھی بخاری صاحب ہی کر رہے ہیں تو اور بھی خوشی ہوئی۔ مشاعرے میں پہنچنے میں ذرا دیر ہوگئی۔ چنانچہ جب میں پہنچا ہوں تو بخاری صاحب فی البدیہہ صدارتی خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور ذکر کچھ میرا ہی تھا کہ ''اس مشاعرے میں شرکت کے لئے شوکت تھانوی بھی آئے ہوئے ہیں جن سے میں یہ پوچھ پوچھ کر تھک چکا ہوں کہ آخر وہ کسی تھانے یا کس تھان سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ ان کا کوئی ایسا گہرا راز ہے وہ کسی طرح اسے کھولنا گوارا نہیں کرتے''۔ اس مشاعرے کے بعد دوسرے یا تیسرے دن بخاری صاحب نے اپنے گھر پر اپنے چند نیاز مندوں کو لنچ دیا۔ اس میں شرکت کے لئے جب میں پہنچا تو بخاری صاحب محض ایک نیکر پہنے باقی مہاتما گاندھی بنے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر دل کو ایک دھچکا سا پہنچا، ہڈیوں کا ایک نحیف ونزار ڈھانچہ تھا۔ ان کے قلب کے دورے کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی، آج ان کا یہ لاغر جسم دیکھ کر بے ساختہ دل سے ان کی صحت اور درازی عمر کی دعائیں نکلنے لگیں مگر بخاری صاحب نے اپنے لطائف وظرافت سے بہت جلد اس اضمحلال کو ختم کر دیا۔ البتہ کھانے کی میز پر جب کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے ایک ڈش سے جیلی اپنی پلیٹ میں نکالی ہے تو بخاری صاحب دوڑ پڑے، ''یہ نہ لینا بھوکا مر جاؤں گا میں۔'' معلوم ہوا کہ وہ صرف ناشپاتی کے ابلے ہوئے چند ٹکڑے اور یہ جیلی ہی کھا سکتے ہیں۔ یہی ان کی غذا ہے اور یہی غذائیت سے بے نیاز غذا کھا کھا کر وہ جی رہے ہیں۔ کچھ نہ پوچھئے کہ کتنا ترس آیا ہے ان پر۔ کئی مرتبہ ارادہ ہوا کہ ان سے کہوں کہ اب آپ امریکہ نہ جائیں مگر میں ان پر وہ خطرہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا جو خود محسوس کر رہا تھا۔ آخر پچھلے سال جب میں ریڈیو پاکستان سے سبکدوش ہو کر پھر صحافت میں آ گیا تھا اور روزنامہ جنگ کی ادارت کے سلسلہ میں مستقلاً کراچی کا ہو گیا اور آخری مرتبہ بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ہمت کر کے ان سے کہہ ہی دیا کہ اب آپ کراچی سے نہ جائیں اور اس کا جواب بھی سن لیا کہ ''اگر آپ پکے کاغذ پر یہ لکھ دیں کہ میں کراچی میں رہ کر نہ مروں گا تو میں امریکہ جانے کا ارادہ ملتوی کرنے تیار ہوں۔'' چنانچہ وہ پھر امریکہ گئے اور اب کبھی امریکہ سے واپس نہ آئیں گے۔ اب کراچی میں کوئی ان کا انتظار نہ کرے گا۔ اب کوئی ان سے اصرار نہ کرے گا کہ امریکہ نہ جایئے۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

حافظ قاری ڈاکٹر محمد نصیرالدین منشاوی

ڈاکٹر راحت اندوری سے پہلی اور آخری ملاقات

لگے گی آگ تو آئیں گے کئی گھر زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے

یہ وہ پہلا شعر تھا جو میرے کانوں سے ٹکرایا تھا۔ کسی نے مجھے واٹس ایپ پر بھیجا تھا۔ دیار غیر کی یہ محفل تھی۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ہر عمر کے احباب مرد وزن جس میں کئی ممالک کے لوگ ہوں گے اُٹھ اُٹھ کر داد دے رہے تھے اور ایک ایک شعر پر ہال تالیوں سے گونج رہا تھا اور کیوں نہ ہو جبکہ شاعر کوئی اور نہیں بلکہ راحت اندوری تھے۔ سانولا رنگ، چہرے پر تازگی، آنکھوں میں باغبانہ چمک، طنزیہ مسکراہٹ، آواز میں گھن گرج اور شعر پڑھنے کا بالکل انوکھا اور منفرد انداز، ہاتھوں کو لہرا لہرا کے سر گھما گھما کے، پیشانی پر بل لئے غزل کا آخری شعر انہوں نے پڑھا اور اس جذبے سے پڑھا کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہنے لگے۔

سبھی کا خون شامل ہے یہاں کی مٹی میں
کس کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

یہ شعر کہہ کر جب وہ شہ نشین سے ہٹے تو بہت دیر تک ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے دہل گیا یہاں تک کہ ناظم محفل کو بھی اپنی بات آگے بڑھانے میں انتظار کرنا پڑا اور اس منظر کو دیکھنے سے ہی احساس ہوتا تھا کہ محفل کا دل ابھی بھرا نہیں بلکہ سامعین ان سے کچھ اور سننا چاہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شعر نے ان کو ہندوستان میں اتنا مشہور کر دیا کہ نہ صرف ادبی و مذہبی لوگ، کیا ہندو کیا مسلمان، کیا سکھ کیا عیسائی کیا بوڑھا کیا جوان بلکہ بچہ بچہ کی زبان پر حب الوطنی میں ڈوبا ان کا یہ شعر جاری ہو گیا اور جب جب یہ شعر ہم سنتے ہیں تو ہمیں اپنے آپ پر فخر ہوتا ہے اور سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے وطن ہندوستان میں کسی کے رحم و کرم پر نہیں کسی کی بھیک اور خیرات پر نہیں بلکہ اللہ کے فضل و کرم سے اپنا حق سمجھ کر رہتے ہیں اور انشاء اللہ العزیز آئندہ بھی عزت و وقار کے ساتھ رہیں گے۔ یہ شعر صرف الفاظ کا حسین امتزاج ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں رہنے والے ہر شہری کے لئے ایک ڈھال ہے اور اس بات پر وکالت کرتا ہے کہ ہندوستان کسی کی جاگیر نہیں بلکہ اس خوبصورت چمن کی آبیاری میں ہم سب کے بالخصوص مسلمانوں کے آبا و اجداد کا خون شامل ہے۔ دہلی کے انڈیا گیٹ کی پیشانی پر کندہ پچاس ہزار سے زاید شہداء کے نام اس بات کے گواہ ہیں:۔ اس غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے:

جو آج صاحب مسند ہیں کل نہیں ہونگے
کرائے دار ہیں ذاتی مکان تھوڑی ہے

اس شعر کی جامعیت کا اندازہ لگائیں کہ ہر دور کے جابر و ظالم، متکبر و سرکش انسانوں کو چاہے وہ بادشاہ ہوں کہ حکمران، وزراء ہوں کہ امراء ہر ایک کے لیے یہ پیغام دیا کہ اللہ عزوجل نے کر دی اگر تھوڑی سی مہربانی تو یہ نہ سمجھنا کہ ہماری حکومت ہمیشہ ہمیشہ رہے گی بلکہ تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ سب کرا دار ہیں یعنی دنیا میں سب بحیثیت کرا دار کے ہیں یہاں ہر ایک کو فنا ہے کسی کو بقا نہیں۔

www.urduacademyts.com

یہ کوئی پانچ چھ سال پرانی بات ہوگی کہ اسی غزل کے ذریعہ میں راحت اندورنی سے متعارف ہوا تھا مجھے شعر وشاعری سے بہت دلچسپی ہے نہ صرف یہ بلکہ اس وقت شاعری کی دنیا کے گوہر نایاب وعالمی شہرت یافتہ شاعر استاذ الاساتذہ اور میرے چچا خسر حضرت رحمٰن جامی مدظلہ العالی سے مشق سخن بھی میں نے جاری رکھی ہوئی ہے اور میرے عزیز دوست اور شہرہ آفاق شاعر ڈاکٹر ضامن علی حسرت کی گرمئی صحبت بھی نصیب ہے مگر قدرت کو یہی منظور ہے کہ میں جام پینے والا بنوں ساقی نہ بنوں۔

میر، غالب، اقبال، شبلی، جوش، فیض، فراز، مخدوم یہ تو ایسے نام ہیں جن کو ہم سن سن کر بڑے ہوئے اور سچ پوچھیں تو طبیعت میں شاعری نے انگڑائی لی تو انہیں کے کلام کا حاصل ہے لیکن عصر حاضر میں جو نام میں نے سنے اور جن کا کلام سن کر میں متاثر ہوا ان میں منور رانا، راحت اندوری، لتا حیا اور شبینہ ادیب ہیں۔ منور رانا کی وہ شاعری جو انہوں نے "ماں" کے عنوان سے کہی ہے اس نے اچھے اچھوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوادے۔ لتا حیا اسلامی شاعری کی وجہ سے مشہور ہیں اور شبینہ ادیب کی دو غزلوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے، ان غزلوں سے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

جو خاندانی رئیس ہیں وہ مزاج رکھتے ہیں نرم اپنا
تمہارا لہجہ بتا رہا ہے تمہاری دولت نئی نئی ہے

ooo

میری امید، میرا پیار، میری آس رہو
تم مجھے چھوڑ کے مت جاؤ میرے پاس رہو

صبح کا وقت تھا ہم انوار العلوم کالج کے اسٹاف روم میں چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک کالج کے اسپورٹس ڈائریکٹر جناب حاجی سجاد تشریف لائے اور کہا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ مشاعرہ ہونے والا ہے لیکن اب تک ہم نے شاعروں کے نام کا اعلان نہیں کیا تھا لیکن اب سن لیجئے کہ کون کون شاعر آنے والے ہیں، منور رانا، راحت اندوری، لتا حیا، شبینہ ادیب، منظر بھوپالی، اقبال اشہر، آلوک سری واستو، سنیل کمار تنگ، خوشبو، قیصر خالد وہ کہے جا رہے تھے اور میری نگاہوں کے سامنے آسمان شعر وادب سے شہاب ثاقب کی طرح ایک ایک شاعر کی تصویر گذرتی جا رہی تھی۔ انہوں نے اپنی بات مکمل کی اور ان تمام ادبی ستاروں کی جھرمٹ جو کہ شمس آباد ایئرپورٹ پر جمع ہونے والی تھی، ان کے استقبال کی ذمہ داری ہم کو سونپ دی۔ ان تمام شاعروں کو شہر کے باوقار اور فائیو اسٹار ہوٹل تاج دکن میں ٹھہرانا قرار پایا۔ چنانچہ ہم شعبہ اردو اور ہندی کے احباب مختلف کاروں میں روانہ ہوگئے۔ شبینہ ادیب، خوشبو اور لتا حیا کو لانے کی ذمہ داری خواتین کو دے دی گئی جب کہ میرے ساتھ اقبال اشہر، آلوک سری واستو، معین شاداب تھے۔ دوپہر ایک بجے کی فلائٹ سے آگے پیچھے یہ سب آگئے۔ البتہ راحت اندوری صاحب کے آنے میں کچھ اور دیر تھی تو ان کو لانے کی ذمہ داری کسی ذمہ دار شخص کو دے دی گئی اور میں مذکورہ احباب کو لے کر ہوٹل پہنچ گیا۔ ہم سب نے ہوٹل کے پرتکلف ظہرانے کا لطف اٹھایا پھر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور شام چھ بجے ان سب کو انوار العلوم کالج کے وسیع وعریض میدان میں منعقدہ

www.urduacademyts.com

چوتھے کل ہند جناب نواب شاہ عالم خان یادگار مشاعرے میں شرکت کرنا تھا۔ دو چار گھنٹے بڑی تیزی سے گذر گئے۔ نماز ظہر تو مسافرین نے ہوٹل میں پڑھ لی ہوگی لیکن مجھے ادائیگی نماز کے لیے ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے تک جانا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ہوٹل کے پچھواڑے میں ایک مصلیٰ ہے تو پھر باقی نمازیں وہیں ادا ہوئیں۔

تمام شاعر وقت مقررہ پر اپنے اپنے کمروں سے نکل کر یکے بعد دیگرے ہوٹل کی شاندار اور بے انتہا خوبصورت لابی میں جمع ہونے لگے۔ میں انتظام میں لگا ہی تھا اور شاعروں کو یکے بعد دیگرے کاروں سے روانہ کر رہا تھا، دفعتاً میری نگاہ صوفے پر براجمان اس شخصیت پر پڑی جس کو دنیا راحت اندوری کے نام سے جانتی ہے۔ محفلوں کی جان اور مشاعرے کی کامیابی کا ضامن ادب کا یہ ستارہ سامنے نظر آیا تو قدم خود بخود اس محبّ وطن شاعر کی طرف اٹھ گئے۔ راحت اندوری صاحب کی طبیعت صحیح چل نہیں رہی تھی اور ان کے ساتھ ایک خادم بھی تھا۔ نظر بھی برابر نہیں تھی اور پیروں میں بھی درد تھا جس کا انہوں نے خود کچھ عرصہ پہلے حیدرآباد میں جناب اسد الدین اویسی کی نگرانی میں ہونے والے احتجاجی جلسے میں اشارہ کیا تھا۔ میں قریب جا کر ان کے سامنے رکھے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا اور میرے دوست یوسف محبوب نگری نے میرا یہ تعارف کروایا کہ یہ صدر شعبہ اردو انوار العلوم کالج ہیں اور بین الاقوامی قاری اور حافظ بھی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ انہوں نے میرا مصافحہ والا ہاتھ لے کر سینے سے لگایا اور کہنے لگے بھائی حافظ صاحب آپ تو جنت میں جائیں گے ہی، ہم کو بھی ساتھ رکھ لینا! اللہ حافظ قرآن کی شفاعت قبول کرتا ہے۔ میں ٹکٹکی باندھے ان کے چہرے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا اور ان کے اندر کا ایک قرآن سے محبت کرنے والا اور عقیدت مند مسلمان میرے سامنے کھڑا تھا۔ بس یہی ملاقات میری اس عظیم شاعر سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ سامنے کار آ چکی تھی اور میرے ہی ہاتھ میں ہاتھ دیئے جناب راحت اندوری ہوٹل کی لابی سے باہر آئے اور کار میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ کار میرے سامنے سے گزر کر اپنی منزل پر روانہ ہو چکی تھی مگر مجھے اس بات کا کس طرح احساس ہو سکتا تھا کہ یہ ملاقات میری ان سے آخری ملاقات ہوگی۔ یہ آخری شاعر تھے جن کو روانہ کر کے میں بھی مشاعرے کے لئے روانہ ہو گیا۔ راحت اندوری صاحب صرف بڑوں کے شاعر نہیں تھے بلکہ اب تو وہ نوجوانوں کی جان بن چکے تھے۔ میرے بیٹے محمد طلحہ شرف الدین کو جب اس بات کا علم ہوا کہ راحت اندوری صاحب آ رہے ہیں تو انہوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹل آ کر ان سے ملاقات کی جب کہ میرے بڑے فرزند حافظ وقاری محمد شعیب شرف الدین اپنے دوستوں کے ساتھ مشاعرے میں ملاقات کی اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہوئے۔

میں ٹھیک ٹھاک ہو کر جب مشاعرہ گاہ پہنچا تو انوار العلوم کالج کا میدان کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ تل دھرنے جگہ نہ تھی بلکہ سانس لینا بھی دشوار تھا۔ داہنی طرف خواتین تھیں تو بائیں طرف مرد اور پورا میدان انسانی سروں کا سمندر نظر آ رہا تھا۔ کیا بچے، کیا بڑے، کیا عورتیں، کیا مرد، کیا غریب کیا امیر

www.urduacademyts.com

سب راحت اندوری صاحب کو سننے آئے تھے بلکہ میں مشکل سے اگلی صفوں تک پہنچ سکا اور صف اول میں جگہ بنالی تاکہ انتظامی امور میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ معین شاداب نظامت کررہے تھے۔ اسٹیج کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا اور صوفوں کو بڑی ترتیب سے رکھا گیا تھا جس پر مہمان اور مقامی شعراء کے علاوہ معززین شہر بالخصوص جناب اسدالدین اویسی معزز رکن پارلیمنٹ وصدر کل ہند مجلس اتحادالمسلمین اور انہیں کے پہلو میں ان کے سمدھی جناب احمد عالم خان اپنی نوابی وضع قطع سے شہ نشین کی زینت کو دوبالا کررہے تھے۔

مشاعرہ شروع ہوا ہی تھا کہ بارش کی بوندوں نے محفل کو نم کرنا شروع کردیا اور خدشہ تھا کہ اگر زوردار بارش ہوئی تو مشاعرہ بکھر جائے کیونکہ یہ کھلے میدان میں ہورہا تھا جس کا کوئی سائباں نہ تھا۔ بارش ہلکی پھوار سے گذر کر جسم کو احساس دلانے والے قطروں تک جا پہنچی لیکن مجمع پر نظر دوڑائیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طوفان بھی آجائے تو ہم اٹھنے والے نہیں ہم تو مشاعرہ سن کر ہی جائیں گے اللہ عزوجل بندوں کی نیتوں کے ساتھ ہوتے ہیں، نیتیں قبول ہوگئیں اور بارش تھم گئی۔ معین شاداب نظامت کررہے تھے اور یکے بعد دیگرے شعراء اپنا کلام سنا کر داد وتحسین کے پھول اپنی گودی میں جمع کررہے تھے۔ بالآخر تقریباً رات کے ساڑھے دس گیارہ بجے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور معین شاداب نے ترقی پسند اور استاذ الاساتذہ کہتے ہوئے جب ڈاکٹر راحت اندوری کو آواز دی تو مشاعرہ گاہ تالیوں سے گونج اٹھا اور نوجوانوں کا جوش وخروش تو دیکھنے لائق تھا۔ ایک طرف ان کے نعرے بازی، شوخیاں اور چیخیں تو دوسری طرف خواتین و حضرات کے چہرے بھی متبسم ہوگئے۔ ڈاکٹر راحت اندوری صاحب نے مائک سنبھالا اور سلام سے آغاز کرتے ہوئے اس شعر سے اپنے کلام کا آغاز کیا کہ:

ہم کو پہچانئے تو ہم کو ہندوستان کہتے ہیں
مگر کچھ لوگ جانے کیوں ہمیں مہمان کہتے ہیں

شہ نشین پر موجود جناب اسدالدین اویسی بھی اس شعر پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے بلکہ شائقین راحت نے کھل کر داد دی۔ راحت صاحب نے مشاعرے کا آغاز ہی ایسے شعر سے کیا تھا کہ وہ سیدھا دشمنوں کے منہ پر طمانچہ تھا۔ پھر انہوں نے دوسرا شعر پڑھا۔

جو چکی چل رہی ہے اس کے دونوں پاٹ الٹے ہیں
جو بے ایمان ہیں وہ ہم کو بے ایمان کہتے ہیں

اس شعر کا جائزہ لیا جائے تو راحت صاحب کی بے باکی ونڈرپن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حق بات کہتے ہوئے وہ کبھی بھی اور کہیں بھی نہیں ڈرے۔

سلسلہ سخن کو جاری رکھتے ہوئے راحت صاحب نے ملت میں ہونے والے انتشار، فرقہ پرستی، مسلکی تناؤ اور اس جیسی مہلک بیماریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک ایسا بے مثال شعر پڑھا کہ ہر ملت کا درد رکھنے والے دل سے آہ نکل گئی۔ شعر پیشِ خدمت ہے۔ کہا:

دکھ تو یہ ہے کہ ابھی اپنی صفیں ترچھی ہیں
یہ برائی میرے لشکر سے نہیں جاتی ہے

اس شعر کے بعد راحت اندوری صاحب نے کہا کہ

www.urduacademyts.com

راحت اندوری ہر اس شخص کے ساتھ کھڑا ہے چاہے وہ کہیں کا رہنے والا ہو چاہے وہ کسی بھی زبان میں ظلم کے خلاف آواز اٹھا رہا ہو راحت اس کے ساتھ کھڑا ہے۔ اور پھر بڑے دردمند اور جوش و جذبے کے ملے جلے انداز میں انہوں نے یہ شعر پڑھے:

اٹھا شمشیر دکھا اپنا ہنر کیا لے گا
یہ رہی جان یہ گردن ہے یہ سر کیا لے گا
صرف ایک شعر اڑا دے گا پرخچے تیرے
تو سمجھتا ہے کہ شاعر ہے یہ کیا کر لے گا

ان اشعار میں انہوں نے شاعر کے مقام کو بتایا ہے کہ شاعر چاہے تو اپنی شاعری کے ذریعہ سے ایک انقلاب برپا کر سکتا ہے جیسا کہ آج بھی ظلم کے خلاف فیض اور حبیب جالب کے شعر پڑھے جا رہے ہیں اور اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے ہندوستان بھر میں شعراء وباء اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان اشعار کے ساتھ ہی راحت صاحب نے اجازت لی لیکن سامعین ان سے کچھ اور سننا چاہتے تھے تو ناظم مشاعرہ کی درخواست پر پھر انہوں نے مائک سنبھالا اور نوجوانوں کے لئے ایک ذو معنی شعر پڑھا اور ایسی راگ انداز سے پڑھا کہ نوجوانوں کی خوشی کے مارے چیخیں نکل گئیں۔ کیا بوڑھے کیا جوان کیا مرد کیا عورت سب قہقہے مار کر ہنسنے لگے اور محفل زعفران زار ہو گئی۔

مائک پر آتے ہی انہوں نے کہا:

"بلاتی ہے"۔ صرف ان دو لفظوں کو چار مرتبہ دہرا کر آگے بڑھے اور کہا:

بلاتی ہے مگر جانے کا نیں
یہ دنیا ہے ادھر جانے کا نیں
کشادہ ظرف ہونا چاہیے
جھک جانے کا بھر جانے کا نیں
وباء پھیلی ہوئی ہر طرف
ابھی ماحول مر جانے کا نیں

اس کے بعد انہوں نے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر بڑے خاص انداز سے ایک شعر پڑھا:

میرے بیٹے کسی سے عشق کر
مگر حد سے گذر جانے کا نیں

یہ وہ آخری اشعار تھے جو سرزمین دکن پر جناب ڈاکٹر راحت اندوری نے پڑھے تھے۔ اس کے بعد بھی مشاعرے کے جاری رہنے کا اعلان کیا گیا مگر لوگ راحت صاحب کے بعد کہاں کسی کو سننے کے لئے تیار تھے سب اٹھنے لگے اور عملاً مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔

لوگ جوق در جوق شہ نشین کی طرف بڑھ رہے تھے تا کہ راحت صاحب سے مصافحہ کریں لیکن راحت صاحب بے چینی محسوس کر رہے تھے، کچھ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا تو انہوں نے مجھ سے کہا میاں یہاں سے جلدی لے چلو۔ چنانچہ مجمع چیرتے ہوئے ہم نے انہیں کمرہ خاص تک پہنچایا جہاں صدر مشاعرہ جناب محبوب عالم خان صاحب نے ان کا استقبال کیا۔ کمرہ خاص میں تصویر کشی کے لئے نوجوانوں کا تانتا لگ گیا تھا سڑک پر ٹریفک جام تھی ہزاروں لوگ نکل رہے تھے، ایسے میں

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

بڑی مشکل سے ان کا ہاتھ تھام کر ان کو کار تک پہنچایا انہوں نے مجھے ڈھیر ساری دعائیں دیں اور کار بڑی مشکل سے ہجوم سے نکل کر اپنی منزل کی طرف چلی گئی۔ نگاہیں بہت دیر تک ان کا تعاقب کرتی رہیں مگر کسے پتہ تھا کہ حیدرآباد کی ان سڑکوں پر راحت اندوری آخری سفر کر رہے ہیں کیونکہ اس مشاعرے کے چند ہی دن بعد پورے ہندوستان میں کرونا وائرس وبا کی وجہ سے "لاک ڈاون" شروع ہوگیا۔ اس طرح انوار العلوم کالج کا مشاعرہ جناب راحت اندوری کے آخری اور یادگار مشاعروں میں سے ایک رہا۔ چنانچہ اسی وبا کا شکار ہوکر قلب کی حرکت بند ہو جانے سے جناب راحت اندوری نے 11/اگست 2020ء کو اس دارفانی سے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے لاکھوں چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر رب حقیقی سے جاملے۔ اِناللہ وانا الیہ راجعون.

راحت اندوری نے اپنی زندگی کی آخری جو غزل لکھی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موت کی آہٹ کو محسوس کر چکے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

نئے سفر کا جو اعلان بھی نہیں ہوتا
تو زندہ رہنے کا ارمان بھی نہیں ہوتا
تمام پھول وہی لوگ توڑ لیتے ہیں
جن کے کمروں میں گلدان بھی نہیں ہوتا
خموش اوڑھ کے سوئی ہیں مسجدیں ساری
کسی کی موت کا اعلان بھی نہیں ہوتا
وبا نے کاش ہمیں بلا لیا ہوتا
تو ہم پر موت کا احسان بھی نہیں ہوتا

راحت صاحب گرم محفل ہوتے تھے مشاعروں میں ان کی موجودگی مشاعروں کی کامیابی کی ضامن ہوتی تھی۔ اللہ عزوجل ان کی خطاؤں کو درگزر کرے، ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے، جنت الفردوس کا باغ بنا دے۔ آمین:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆☆

حافظ قاری ڈاکٹر محمد نصیرالدین منشاوی
صدر شعبہ اُردو
انوار العلوم ڈگری کالج، ملے پلی، حیدرآباد
ڈائریکٹر شرفیہ قرأت اکیڈیمی

باتیں جن سے خوشبو آئے

☆ زیادہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔
☆ دوسروں کے آنسوؤں کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے دامن میں جذب کر لینا انسانیت کی معراج ہے۔
☆ نیک بننے کی کوشش کرو جیسے حسین بننے کی کوشش کرتے ہو۔
☆ اعتماد وہ شیشہ ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو دوبارہ نہیں بنتا۔
☆ راحت کثرت آمدنی میں نہیں، قلت مصارف میں ہے۔
☆ مہمان کو رخصت کرنے کے بعد اس کی شکایت مت کرو۔
☆ بے موقع بولنے سے چپ رہنا بہتر ہے۔
☆ بری صحبت سے دور رہنا بہتر ہے۔
☆ غیبت عمل کو کھا جاتی ہے۔
☆ ماں باپ کا حکم چاہے ناگوار ہو، قبول کرلے۔
☆ بحث کرنے میں جاہل سے شکست کھالے۔

www.urduacademyts.com

انفارمیشن ٹکنالوجی اور اردو۔ روزگار کے مواقع

دنیا کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ چند ایجادات نے دنیا کے رخ کو بدل کر رکھ دیا اور انقلابات کا ذریعہ بنے جس نے انسانی دنیا میں ہلچل برپا کردی۔ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار کو اگر ایجادات سے واقع ہونے والے تغیرات کے زاویے سے دیکھا جائے تو چار ایسی اہم ایجادات ہیں جن میں سے ہر ایجاد سے ایک انقلاب کی تاریخ جڑی ہوئی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر نسلِ انسانی، ایجادات پر اپنی ترقیات کا دارومدار رکھتی ہے۔

پہیہ (Wheel) کی ایجاد سے حمل ونقل (Transport) کے میدان میں انقلاب برپا ہوا اور تیز رفتار بلکہ برق رفتار سواریاں ایجاد ہوئیں۔ بجلی Electricity کی دریافت نے انسانی دنیا کو تاریکیوں سے روشنیوں کی راہ بتائی اور دنیا کو روشنی سے منور کردیا جس کے بغیر موجودہ انسانی زندگی کا تصور محال ہے۔ چھاپہ خانہ (press) کی ایجاد نے دنیا میں نشاتِ ثانیہ کی راہ ہموار کی اور انقلابِ فرانس میں کلیدی رول ادا کیا۔ دنیا میں علم کے عام ہونے کی راہ ہموار ہوئی اور اس کی ایجاد سے مواصلات میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور دنیا میں معلومات کا تبادلہ ممکن ہوگیا۔

معلوماتی۔ اطلاعاتی تکنالوجی:

InformationTechnology: انسانی دنیا کی تاریخ کا بڑا انقلاب معلوماتی ٹکنالوجی سے وابستہ ہے جس کے ذریعہ وہ تغیرات اور تبدیلیاں ہوئیں جو کبھی انسان کے خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ وسیع بیکراں اور کشادہ ترین دنیا اپنی تمام وسعتوں کے باوجود سمیٹ کر ایک گاؤں میں تبدیل ہوکر رہ گئی اور گلوبل ولیج کا تصور پیدا ہوا جس نے ساری دنیا کو، سارے برِ آعظموں کو، تمام ملکوں اور تمام صوبوں اور ریاستوں کو سمیٹ کر فاصلوں کو مٹادیا۔ معلوماتی ٹکنالوجی نے نعرہ دیا ''کرلو دنیا مٹھی میں''۔

معلوماتی۔ اطلاعاتی ٹکنالوجی کمپیوٹر ایجادات کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ دنیا کی کسی بھی ملک کے کسی بھی شہر سے مطلوبہ، کسی بھی مقام سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ معلومات کا تبادلہ اور دنیا جہاں کی معلومات ایک چھوٹے سے سکرین پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی اس تیز رفتار، حیرت انگیز حرکاتی اور کرشماتی ایجاد نے عالمِ انسانیت پر عجیب اثر اندازی حاصل کرلی ہے۔

موجودہ دور انفارمیشن ٹکنالوجی کا دور ہے۔ لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر دنیا کا یہ تقاضا ہے کہ ہر شخص جو اپنے آپ کو اہلِ علم سمجھتا ہے وہ اس ٹکنالوجی سے جڑ جائے۔ اگر کوئی اس صبا رفتار ترقی کی کرشماتی ایجادات سے اپنے آپ کو بے بہرہ اور ناواقف رکھتا ہے تو وہ اس تیز رفتار دنیا سے الگ تھلگ ہوکر ترقی کیے بغیر جہاں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے

www.urduacademyts.com

ناواقف شخص کو آج دنیا نے جاہل قرار دے دیا ہے۔

انفارمیشن ٹکنالوجی نے ہر شعبے اور زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہے۔ حیاتِ انسانی کے معمولات اور کارزارِ زندگی کی مشغولات شدید طور پر متاثر ہوئی ہیں۔ اس طرح انسانی رویے، ذہنی اپج اور فکر ونظر کے زاویے تبدیل ہو گئے ہیں اور انفارمیشن تکنالوجی نے سماجی زندگی کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

ایسی صورتِ حال میں قابلیت وصلاحیت اور لیاقت ومہارت رکھنے والوں کے لیے بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس جدید تکنالوجی سے جڑے رہیں۔ ملازمتوں کے مواقع، روزگار کی تفصیلات اور ترقیات کی راہوں کی تلاش انٹرنیٹ ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

اگر کوئی قابل شخص بہتر سے بہتر روزگار کا طلب گار ہو تو اسے اپنا رشتہ انٹرنیٹ سے جوڑنا ناگزیر ہو جاتا ہے کیوں کہ ملازمتوں سے متعلق جانکاری اور تفصیلات کے لیے یہی ایک بہترین ذریعہ ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص مرکزی و ریاستی حکومت، بین الاقوامی اور خانگی نوعیت کے کسی بھی شعبے کی ملازمت کا خواہاں ہے تو اسے تمام معلومات انٹرنیٹ پر دستیاب ہو سکتی ہیں جب کہ انٹرنیٹ کے بغیر وہ ان سے محروم رہ جاتا ہے۔

روزگار، ملازمت کے حصول کے لیے بہت سی ایسی ویب سائٹس ہیں جن پر کوئی شخص اپنی تعلیمی صلاحیت کے مطابق مضمون اور موضوع کے لحاظ سے اپنی پسند کے کسی بھی شعبۂ زندگی میں ملازمت سے متعلق معلومات صرف چند ہی لمحوں میں حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے بہت سے ڈاٹ کومس ہیں جن پر رجسٹر کر کے ملازمتوں کی جانکاری اپنی موبائل پر sms کے ذریعے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر اس میدان میں اہلِ اردو روزگار حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ملازمتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

حکومتِ ہند کے ذریعے شائع ہونے والے انگریزی، اردو اور ہندی اخبار ''روزگار سماچار'' اور Employment News آج انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں، جن میں زندگی کے مختلف شعبوں میں روزگار کے مواقع یا کیریئر آپرچونیٹیس سے متعلق مختلف شعبوں کے ماہرین کے علمی اور رہنما مقالے بھی شائع ہوتے ہیں، یہ سب عام انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔

انٹرنیٹ پر بے شمار ایسے سرچ انجن موجود ہیں جو اپنے استعمال کنندہ (user) کو پلک جھپکتے ایسے ویب سائٹس اور پروگراموں تک لے جانے کے منتظر ہوتے ہیں اور مختلف زمروں کے تحت سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ملازمتیں قابل افراد کی منتظر رہتی ہیں۔

اس پس منظر میں یہ سوال کس حد تک اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ معلومات کے دھماکے کے اس دور میں جسے Exposion of Knowlege کا نام دیا جا رہا ہے، اہل اردو کا کیا موقف ہے؟ انٹرنیٹ پر کیا صورتِ حال ہے؟ اور اہلِ اردو کے لیے روزگار کے مواقع انٹرنیٹ پر

www.urduacademyts.com

کس حد تک دستیاب ہیں؟

اہلِ اردو اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ اردو زبان اور اس کا ادب موجودہ انفارمیشن تکنالوجی کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتا جب کہ یہ خیالِ خام اہلِ اردو کی غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دراصل اہلِ اردو اپنے بوسیدہ قول میں بند ہوکر قدیم روش پر چلنے کے عادی ہو چکے ہیں جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بہت پہلے کہا ہے:

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی ہے

اردو زبان میں وہ لچک ہے جو ہر زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو میں وہ قدرتی قوت ہے جو زمانے کے ساتھ متحرک ہوسکتی ہے۔ اردو زبان کی تاریخ اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ اردو نے نہ صرف زمانے کی روش کا ساتھ دیا بلکہ آگے بڑھ کر زمانے کی رہنمائی اور دستگیری کا فریضہ بھی انجام دیا۔ آیئے اب انفارمیشن تکنالوجی کے حوالے سے اردو کے طلبہ کے لیے روزگار کے کیا کیا مواقع فراہم ہیں، اس کا جائزہ لیں۔

اردو نے لوگوں کے وہم و گمان کے برخلاف مواصلاتی دنیا میں اپنا غلبہ برقرار رکھا ہے۔ اردو کے صرف ہندوستان میں چلنے والے دس سے زائد ٹی۔وی چیانلس اور دنیا کے دیگر مقامات سے جاری ہونے والے بے شمار sattelite چیانلس اور انٹرنیٹ چیانلس نے ثابت کر دیا کہ اردو کسی بھی میدان میں پس ماندہ زبان نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اردو چیانلس E.T.V اردو، سہارا اردو، DD اردو چیانل، اردو چیانل، منصف اردو چیانل، HMTV اردو چیانل، اردو QTV چیانل، Peace TV، سیاست اردو چیانل، zeeTv اردو وغیرہ، وغیرہ۔

ایک ۔۔ چیانل میں کئی ہزار ملازمتوں کے مواقع موجود ہیں ۔مثلاً Production، Post Production، Reproduction میں ایڈیٹنگ، رپورٹنگ، اینکرنگ، News Readers، ترجمہ نگار، فوٹو گرافرس، ویڈیو گرافررس بالخصوص شعبۂ اشتہارات میں اردو دانوں کے لیے کئی ملازمتوں کے مواقع موجود ہیں۔

اردو کے پرنٹ میڈیا کا میدان بھی اپنی شاندار صحافتی تاریخ رکھتا ہے۔ اردو صحافت میں پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ دو چار ایڈیٹر، ایک دو مترجمین اور چند کاتب اردو کے اخباری دنیا کی کل کائنات ہے، لیکن آج طلبہ کے لیے یہ خوش خبری ہے کہ اس میدان میں بھی ملازمتیں حاصل کر سکتے ہیں ۔مثال کے طور پر correspondents، reporters، کالم نگار، فیچر نگار، ترجمہ نگار، آرٹسٹ، کارٹونسٹ، ایڈیٹنگ، کمپوزنگ، ڈزیننگ، news readers، ٹیلی پرنٹنگ اور ٹیپنگ وغیرہ بے شمار مواقع فراہم ہیں جو قابل حضرات کی تلاش میں ہیں۔

ہندی فلم انڈسٹری میں بھی اردو دان بالخصوص زبان و ادب پر مہارت رکھنے والوں کے لیے بہتر سے بہتر روزگار

www.urduacademyts.com

کے مواقع موجود ہیں۔

آج کے دور میں اردو کے طلبہ کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ انفارمیشن ٹکنالوجی سے ہمیشہ جڑے رہیں۔ یہ نہ صرف زمانے کا تقاضا ہے بلکہ وقت کی پکار بھی ہے۔ایسے مختلف میدانوں میں اردو کے قابل طلبہ کی ضرورت ہے جو اردو اور علاقائی زبانوں میں مہارت کے ساتھ ساتھ انفارمیشن ٹکنالوجی سے وابستہ ہوں۔

اردو کے طلبہ کے لیے انفارمیشن ٹکنالوجی کے میدان میں ترجمہ نگاری کی بھی بہت سے امکانات ہیں کیوں کہ اردو میں انسائکلو پیڈیا اور وی کی پیڈیا جیسے سینکڑوں پروجکٹس اردو میں منتقل کیے جارہے ہیں،جن میں ایک محدود اندازے کے مطابق کئی لاکھ افراد کی ضرورت ہے۔ دلچسپی رکھنے والے اردو کے طلبہ اس میدان میں بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

سرکاری سطح پر ملازمتوں کے جو مواقع اہلِ اردو کو فراہم کیے گیے ہیں یا فراہم کیے جانے چاہیے ان میں جہاں اکثریت اردو دانوں کی ہو وہاں حکومت کو چاہیے کہ تمام اشتہارات، سرکاری اعلانات اردو ہی میں جاری کیے جانے چاہئیں جس کی وجہ سے اردو میں روزگار کے بہت سے مواقع نکل آسکتے ہیں۔

آج اردو کے طلبہ کو اپنی مایوسی اور احساس کمتری کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔اردو زبان نے انفارمیشن ٹکنالوجی کا بھرپور ساتھ نبھایا ہے۔اس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ سینکڑوں اردو ڈاٹ کومس، لاتعداد ویب سائٹس اور بے شمار ادیبوں کے بلاگس موجود ہیں۔اسی طرح اردو کی لاکھوں کتابیں نیٹ پر دستیاب ہیں۔

اردو طلبہ و طالبات کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اردو زبان کسی قید میں محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک عالمی اور آفاقی زبان بن چکی ہے،جس نے ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور اردو میں ملازمتیں بھی مخصوص جغرافیائی خطے تک محدود نہیں ہیں ۔یہاں صرف قابلیت و صلاحیت اور لیاقت و مہارت کی ضرورت ہے۔

بقول شاد عظیم آبادی:

یہ بزمِ مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

☆☆☆

ڈاکٹر محمد نثار احمد
اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی، اے۔پی

ذرا سوچیے

اگر بے حجاب، ننگے سر، تنگ کپڑے پہن کر گھومنا اور
اپنے جسم کی نمائش کرنا
ماڈرن ازم کہلاتا ہے تو
جانور سے زیادہ ماڈرن تو کوئی بھی نہ ہوا

www.urduacademyts.com

آن لائن اُردو کی تدریس میں گوگل کی خدمات

موضوع کا تعارف:

موجودہ دور انٹرنیٹ کا دور ہے۔آج کے اس ترقی یافتہ دور میں ٹکنالوجی نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔عہد جدید میں رونما ہونے والی نت نئی تبدیلیاں ٹکنالوجی ہی کی دین ہیں۔انٹرنیٹ اور میڈیا نے دنیا میں انقلاب برپا کیا ہے۔کمپیوٹر آج کے اساتذہ وطلباء کی ایک اہم ضرورت بن گیا ہے۔انفارمیشن اور کمیونیکیشن ٹکنالوجی نہ صرف اساتذہ کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو فروغ دینے میں معاون و مددگار ثابت ہورہی ہے بلکہ طلباء بھی دورِ جدید کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر بہت کچھ استفادہ کررہے ہیں۔کیونکہ ٹکنالوجی کے استعمال سے نہ صرف سماجی رویوں میں تبدیلی آتی ہے بلکہ ہر طبقے کے طلباء کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔جدید ٹکنالوجی اور انٹرنیٹ سے ہونے والی یہ تبدیلیاں اتنی کارآمد ہوگئی ہیں کہ مہینوں کے کام دنوں میں نہیں بلکہ لمحوں میں مکمل ہورہے ہیں۔انٹرنیٹ کی آمد اور میڈیا کے استعمال نے تو پوری دنیا کو گلوبل ویلج بنا دیا ہے۔جسے ہم الکٹرانک عہد یا پھر سائبر ویلج بھی کہتے ہیں۔انٹرنیٹ کے ذریعہ دنیا مٹھی میں آگئی ہے کہ دنیا بھر کی معلومات ہم بیک وقت حاصل کرسکتے ہیں۔ٹکنالوجی کے اس دور کو ڈیجیٹل دور کہا جارہا ہے۔موجودہ دور میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی شئے اگر کوئی ہے تو وہ کمپیوٹر پر موجود گوگل سرچ انجن ہے۔ہم گوگل سرچ کے ذریعہ نامعلوم شئے کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔آن لائن بینکنگ،آن لائن شاپنگ،آن لائن تجارت،آن لائن پرواز بکنگ،آن لائن گیس بکنگ،آن لائن بجلی بل کی ادائیگی وغیرہ ضروری کاموں کو جس طرح منٹوں میں کرواسکتے ہیں اسی طرح آن لائن زوم میٹنگ،آن لائن اسکائپ،آن لائن گوگل میٹ،آن لائن گوگل کلاس روم، ای لرننگ، ای ٹیچنگ یا پھر ای کانٹنٹ کے ذریعہ درس و تدریس کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔

گوگل کی خدمات:

گوگل دنیا کا واحد سرچ انجن ہے جہاں پر دیگر زبانوں کی طرح اُردو میں بھی دنیا بھر کی معلومات مفت فراہم ہوتی ہیں۔گوگل سرچ انجن ہی نہیں بلکہ ایک فن بھی ہے جس کے بارے میں جاننا بے حد ضروری ہے۔گوگل کی واحد خوبی یہ ہے کہ ہر ملک سے تعلق رکھنے والے اپنی زبان میں لفظ گوگل سے واقف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ گوگل کو انٹرنیٹ کا سلطان بھی کہتے ہیں۔گوگل ایک امریکی ادارہ ہے جس کے قیام کا مقصد عام صارفین کو انٹرنیٹ پر کسی بھی موضوع پر درکار مواد تلاش کرنے کے لیے سرچ انجن فراہم کرنا تھا۔اسی وجہ سے گوگل کو مقبولیت حاصل ہوتی گئی۔چنانچہ آج یہ دنیا کا سب سے زیادہ استعمال ہونے والا سرچ انجن ہے۔دراصل لفظ گوگل ایک

www.urduacademyts.com

ریاضیاتی اصطلاح 'گوگول' سے بنا ہے۔

جنوری 1996ء میں دو افراد 'لیری پیج' اور 'سرجے برن' جو Stanford University California میں پی ایچ۔ ڈی کے اسکالرز تھے انہوں نے مل کر 'گوگل تحقیق' منصوبہ کی بنیاد رکھی۔ اس منصوبہ کا اہم مقصد انٹرنیٹ پر موجود مواقع کی درجہ بندی کرنا تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ صارفین اس کو زیادہ پسند کرنے لگے اور اب گوگل نہ صرف سرچ انجن بلکہ دیگر بھی کئی خدمات مہیاء کرنے والا آلہ بن گیا۔ گوگل کی دیگر خدمات میں برقی پیغام رسانی (GMail)، ویڈیو شیرنگ (You Tube)، سوشیل نیٹ ورک (Google Plus) گوگل میٹ (Google Meet) گوگل نقشہ جات (Google Maps) اور بہت ساری خدمات ہیں۔

گوگل کی شروعات ہوکر تقریباً 34 سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ گوگل میں بہت ساری تبدیلیاں آتی گئیں۔ جب گوگل کی شروعات ہوئی تو مارکیٹ پر Yahoo کی اجارہ داری تھی جبکہ MSN مدِ مقابل تھا۔ اس کے علاوہ مائکروسافٹ نے گوگل کے مقابل اپنا علاحدہ سرچ انجن بنگ کے نام سے شروع کیا مگر گوگل نے انٹرنیٹ کی مارکیٹ میں اپنے آپ کو منوالیا ہے۔ گوگل نے GMail کی خدمت شروع کی تو ایک جی بی میل بکس اپنے صارفین کو فراہم کیا اور اس میں روزانہ اضافہ ہوتا رہا۔ آج کل مفت جی میل اکاؤنٹ کے لیے میموری کی گنجائش 15GB ہوچکی ہے۔

گوگل کے بارے میں بعض ذی ہوش صارفین کو ڈیٹا چوری ہونے کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔ چونکہ گوگل صارفین کے بارے میں ہر قسم کا ڈیٹا اکھٹا کرتا ہے۔ برقی ڈاک کو پڑھتا ہے، اس لیے ذی ہوش صارفین اخفائے راز (Privacy) کے حوالے سے اکثر شاکی رہتے ہیں۔ صارفین کا شک بجا ہے کیونکہ ہم اپنی اہم معلومات جو ہم ہر کسی سے مخفی رکھنا چاہتے ہیں لیکن گوگل پر ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ انہیں شکوک کو مدنظر رکھتے ہوئے بالآخر گوگل کے مالک نے ان اندیشوں کے برحق ہونے کا اعتراف کرلیا ہے۔ گوگل کے موجودہ چیرمین 'سندر پچائی' ہیں جو ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ گوگل کا مرکزی دفتر جو کہ گوگل پلکس GooglePlex کہلاتا ہے۔ ماؤنٹین ویو کیلی فورنیا میں واقع ہے گوگل کی آمدنی کا سب سے بڑا انحصار انٹرنیٹ اشتہارکاری اور چند کمپیوٹر سافٹ ویر کی فروخت پر ہوتا ہے۔

گوگل برقی پیغام (GMail):

جی میل گوگل کی جانب سے فراہم کی جانے والی مفت ای میل سروس ہے۔ جی میل کا آغاز یکم اپریل 2004ء کو ہوا۔ ابتداء میں ہر صارف کو ایک گیگا بائٹ جگہ فراہم کی گئی جو Hotmail وغیرہ کی 2 سے 4 میگا بائٹ جگہ سے کہیں زیادہ تھی۔ بعدازاں، جی میل کی جانب سے اس میں وقتاً فوقتاً مزید اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔ ہر جی میل پیغام بہ شمول منسلکات 25 ایم بی پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ جی میل تلاش کی سہولت پر مشتمل انٹرفیس اور انٹرنیٹ فورموں کے جیسا مکالماتی

www.urduacademyts.com

منظر فراہم کرتا ہے۔ جون 2012ء کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا بھر میں 425 ملین فعال صارفین کے ساتھ جی میل سب سے زیادہ ہونے والی ویب مرکزای میل سروس ہے۔ مئی 2014ء میں گوگل پلے اسٹور سے اینڈرائیڈ آلات پر ایک بلین بار انسٹال ہونے والی پہلی ایپ کا اعزاز جی میل کو حاصل ہوا۔

آن لائن تدریس کے وسائل:

آج کے اس پرآشوب دور میں پوری دنیا 'کرونا' کے عذاب سے گزر رہی ہے۔ ان حالات میں جبکہ اساتذہ و طلباء گھروں تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں۔ اس افراتفری کے ماحول میں گوگل میٹ ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی بدولت اساتذہ طلباء سے جڑ سکتے ہیں۔ دیگر زبانوں کی طرح اُردو زبان بھی انٹرنیٹ پر اپنا اہم مقام بنا چکی ہے۔ چونکہ اردو زبان زمانے کے لحاظ سے تبدیلیوں کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انٹرنیٹ کی مدد سے اُردو اخبارات، اُردو کتابیں اور معلوماتی مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ دور کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کتابیں، اخبارات اور رسائل کو انٹرنیٹ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے ہم منصوبہ بندی کے تحت اُردو زبان میں Projects, PPT's، آڈیو، ویڈیو، شارٹ فلمیں، Lessons، وغیرہ بناسکتے ہیں۔ اساتذہ انٹرنیٹ کے ذریعہ آن لائن Webinars پیش کرسکتے ہیں۔ اسی طرح سے طلباء زوم ایپ کے ذریعہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر درس و تدریس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ گوگل اور ویکیپیڈیا کے ذریعہ اردو کے مختلف سائٹس پر پہنچ کر اردو ادب سے واقف ہوسکتے ہیں۔ اردو سائٹس کے ذریعہ شعری اور نثری خدمات پر مشتمل مواد بروقت حاصل کرسکتے ہیں۔ ڈیجیٹل بورڈ کے ذریعہ پر اثر درس و تدریس کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ بلاشبہ پاور پوائینٹ پریزینٹیشن کے ذریعہ کمرۂ جماعت میں پر اثر تعلیمی تدریس ہوسکتی ہے۔ موبائل فون جیسے بلیک بیری، اینڈرائیڈ اور آئی فونس کو بہت اہمیت حاصل ہے جو ہماری انگلی کی جنبش کے ذریعہ لمحوں میں کام انجام دیتے ہیں۔ موجودہ دور میں کالج اور جامعات کے اساتذہ کو HRDC کی جانب سے ریفریشر اور اورینٹیشن کورسز کو زوم ایپ یا گوگل میٹ کے ذریعہ موبائل فون پر گھر بیٹھے اساتذہ کو تربیت دی جارہی ہے۔ E-Content گوگل کلاس رومس کے ذریعہ درس و تدریس کا کام انجام دیا جارہا ہے۔ ان ذرائع کے استعمال سے نہ صرف وقت کی بچت ہورہی ہے بلکہ دور دراز ریاستوں سے آنے والے شرکاء کا زرِسفر کی بچت ممکن ہوگئی ہے۔

گوگل میٹ کے ذریعہ تدریس:

گوگل میٹ کو نہ صرف اسکول کے لیے بلکہ کالجس کے لیے بھی تعلیم کا وسیلہ بنادیا گیا ہے۔ ٹکنالوجی اب ہمارے گھروں تک آچکی ہے۔ ہر گھر میں ایک اسمارٹ فون لازمی ہوگیا ہے۔ چنانچہ طلباء، اسکالرس اور اساتذہ اس کے ذریعہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہورہے ہیں۔ آن لائن میٹنگز، آن لائن

www.urduacademyts.com

تدریس، آن لائن ویبینارز اور ٹریننگ پروگرامز، آن لائن توسیعی لیکچر، آن لائن مشاعرے، آن لائن مباحثے غرض بیسیوں ایسے کام ہیں جو زوم، اسکائپ اور گوگل میٹ کے ذریعہ منعقد کیے جارہے ہیں۔ گوگل میٹ کے ذریعہ ہم نہ صرف اپنے طلباء کی رہنمائی کرتے ہیں بلکہ پیشہ ورانہ طرز کی مہارتیں حاصل کرسکتے ہیں۔ گوگل نہ صرف ہماری تدریسی مہارتوں میں اضافہ کا سبب بنتی ہے بلکہ ٹکنیکی مہارتوں میں بھی اضافہ کرتی ہے۔ گوگل میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ بس وقت کی ضرورت ہے۔ گوگل میں طلباء کے لیے گوگل کلاس روم ہے تو اسکالرز کے لیے گوگل اسکالرز ہے۔ گوگل بکس بھی طلباء و اسکالرز اور قاری کی رہنمائی کے لیے مہیا کیے گئے ہیں۔

گوگل ڈرائیو Google Drive:

گوگل ڈرائیو ایک ایسی محفوظ جگہ ہے جہاں معلومات جو اس ڈرائیو میں جمع کی گئیں ہوں محفوظ رہتی ہیں۔ اگر ہمارا کمپیوٹر یا Andriod فون خراب ہوجائے یا لیپ ٹاپ کا ڈاٹا چلا جائے تو ایسی صورت میں فکر کی کوئی بات نہیں کیونکہ گوگل ڈرائیو، ڈاٹا کو جو کہ میل کیا گیا ہے اسے محفوظ کرلیتا ہے۔ گوگل ڈرائیو میں جیسا کہ ہم نے جانا کہ 15 GB ڈاٹا اسٹوریج کی سہولت ہوتی ہے جو کہ بہت زیادہ ہے۔ ہمارے جی میلس، آڈیوز، ویڈیوز، ڈاکیومنٹس اسی ڈرائیو میں محفوظ رہتے ہیں۔ گوگل ڈرائیو کے ذریعہ آن لائن کوئیز، آن لائن ویبینار، آن لائن کلاس تیار کرسکتے ہیں۔ گوگل ڈرائیو میں گوگل ڈاکیومنٹس، گوگل شیٹس، گوگل سلائیڈس، گوگل کلاس روم اور ویڈیو، آڈیو، ترجمہ، آڈیو سے پیراگراف یعنی آواز سے تحریر، اخباری تحریر جو کہ اسکیان کی گئی ہو اس کی اصل تحریر غرض کہ کئی طریقے ہیں جنہیں سیکھنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ موجودہ دور کی یہ اشد ضرورت ہے کہ اُردو اساتذہ خود کو اپ ڈیٹ رکھیں تاکہ درس و تدریس اور اکتساب کے عمل میں کوئی خلا پیدا نہ ہو۔ یہ اکیسویں صدی ہے جس کے کچھ تقاضے بھی ہیں ہمیں ان تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ چنانچہ ہمیں ہر میدان میں آگے رہنا ہے۔ آج کل روایتی کلاسس کی بجائے تکنیکی و معلوماتی کلاسس کو اہمیت دی جارہی ہے۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے طلباء کے ذوق کے لحاظ سے اساتذہ کو بھی اپنا ادبی معیار بدلنا ہوگا۔ طلباء کی دلچسپیوں کے مطابق انہیں نئے طریقے سے درس و تدریس کے فرائض انجام دینے ہوں گے۔

گوگل پر ویب سائٹس کی سہولت:

گوگل پر بہت سارے اُردو کے ویب سائٹس موجود ہیں لیکن اس کے استفادہ کنندگان بہت کم ہیں۔ اس کے استعمال میں اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ اُردو زبان کی ترقی و فروغ میں اضافہ ہو۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان کی گوگل کلاس روم کے ذریعہ تدریس موجودہ دور کے لحاظ سے بے حد ضروری ہے۔ میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعہ اردو کا جو فروغ ہے اس کے استعمال کے ذریعے طلباء کو انٹرنیٹ پر موجود اُردو زبان و ادب سے واقف کروانا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔ کیونکہ اب اُردو زبان صرف کتابوں کی زیب و

www.urduacademyts.com

زینت نہیں رہی ہے بلکہ انٹرنیٹ اور میڈیا میں بھی اپنا اہم مقام بنا چکی ہے۔ ہر اُردو داں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اُردو اور جدید ٹکنالوجی کے مابین ہم آہنگی کو فروغ دے تا کہ کمپیوٹر کو اردو زبان میں استعمال کرتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکے۔ اساتذہ اپنے طلبا کو جدید ٹکنالوجی کے استعمال سے درس وتدریس میں اثر انگیزی پیدا کریں تا کہ اُردو کی ترقی وفروغ میں مزید اضافہ ہو۔ آجکل اسمارٹ فونس کے ذریعہ اُردو میں تعلیمی تدریس ممکن ہوگئی ہے۔ گوگل کلاس روم، گوگل میٹ یا زوم میٹ کے ذریعہ طلباء کو آن لائن کلاسس فراہم کرنے میں اسمارٹ فونس کا اہم کردار ہے۔ کیونکہ آج کل انہی وسیلوں سے تدریس کا عمل مکمل ہو رہا ہے۔ طلباء کو کلاسیکی ادب کی تدریس کے لیے قدیم شعرا کا کلام جو کہ انٹرنیٹ پر موجود ہے یا ان کے بارے میں تیار کی گئیں ویڈیوز دکھا سکتے ہیں یا اردو شعرا جیسے محمد قلی قطب شاہ، میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، علامہ اقبالؔ وغیرہ کا کلام یا پھر ان شعرا کے سوانحی حالات پر مشتمل ڈاکیومنٹریز موبائل فونز سے کمپیوٹر یا پراجیکٹر کو کنیکٹ کر کے طلباء کو بر وقت دکھا سکتے ہیں۔ اس طرح کی کلاسس طلباء کے لیے نہایت دلچسپ اور موثر ثابت ہوسکتی ہیں۔

گوگل کلاس روم Google Classroom:

گوگل کلاس روم کو جدید طرز کی کلاس روم کی حیثیت حاصل ہے۔ طلبا کی آن لائن تدریس میں بہترین سہولت ہے۔ گوگل کلاس روم میں کئی ایک طریقے ہیں۔ طلباء کے لیے نوٹس کو محفوظ کرنے کی سہولت، اسائنمنٹ (Assignment) جمع کرنے کی سہولت، طلباء کے لیے معروضی سوالات یا Quiz پر مشتمل گوگل فارمس کے ذریعہ طلباء کی ذہنی استعداد کی جانچ، انٹرنلس کا انعقاد وغیرہ کو سیٹ اپ کیا گیا ہے۔ مضمون سے متعلق ویڈیوز، آڈیوز اور ڈاکیومنٹس کے لنکس اسی طرح سے ویب سائٹس یا شخصی ویب سائیٹس کے لنکس کو محفوظ کرنے کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ یوٹیوب پر اُردو شاعری یا نثر سے متعلق کوئی بھی ویڈیو Download کر کے طلباء کو دکھائی جاسکتی ہے۔ یوٹیوب پر اُردو زبان میں بے شمار ویڈیوز دستیاب ہیں۔ ہم جس موضوع پر چاہے کلک کر کے طلباء کو دکھا سکتے ہیں۔ طلباء کے لیے آن لائن مشاعروں کا انعقاد عمل میں لاسکتے ہیں تا کہ نہ صرف مقامی شعراء سے طلباء واقف ہوں بلکہ انہیں بھی شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہو۔ طلباء کو اُردو کی آن لائن سرگرمیوں میں مصروف رکھیں۔ یوں تو سوشیل میڈیا پر طلباء اپنے آپ کو مصروف رکھتے ہیں تو اُن کی دلچسپیوں کو ایک راہ عطا کرنے کے لیے اُردو ویب سائیٹس پر پہنچنے کے لیے انہیں ترغیب دیں۔ طلباء ویب سائیٹس سے استفادہ کرتے رہیں تو اُردو سوشیل میڈیا پر تہلکہ مچادے گی۔

آن لائن ویبنارز:

ویبینار ایک آن لائن سیمینار ہے جسے ہم آن لائن کانفرنس یا ورکشاپ کے طور پر پیش کرسکتے ہیں۔ کسی سیمینار میں میزبان اور سامعین ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور اپنے اپنے مضامین پیش کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس ویبینار آن لائن پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں میزبان اور سامعین اپنے اپنے

www.urduacademyts.com

مقام پر یا گھروں میں یا آفس میں اپنے موبائیل یا کمپیوٹر پر رہ کر ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں جس کے لیے ایک ہوسٹ کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنی مہارتوں کے ذریعہ درس و تدریس کا کام انجام دیتا ہے۔ اسی طرح سے توسیعی لکچرز کی پیش کشی کے علاوہ اساتذہ یا ریسرچ اسکالرز کی مضمون کی پیش کشی ہوتی ہے۔ ویبینارز کے ذریعہ مشاعرہ یا 'غزل پر تبصرہ' کیا جاسکتا ہے۔ سامعین اپنی رائے دے سکتے ہیں۔

گوگل ای کتاب Google E Books:

اُردو ویب سائٹس پر نہ صرف شاعری بلکہ نثری ادب پر کتابیں موجود ہیں جو ڈیجیٹلائز کی جاچکی ہیں۔ ای کتاب، ای لائبریری وغیرہ کے ذریعہ ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں۔ ویب سائٹس کے ذریعہ اُردو زبان و ادب کے فروغ میں جو کام کیا جارہا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ لیکن وقت کا تقاضہ ہے کہ اسے سب سے بڑا آن لائن اُردو زبان و ادب کا گہوارہ بنائیں، بزمِ اُردو ڈاٹ لائبریری۔ان، ریختہ ڈاٹ آرگنائزیشن، بی بی سی اُردو ڈاٹ کام، اُردو لرننگ ڈاٹ کام، اُردو لغات ڈاٹ کام، اُردو محفل لائبریری، کتاب گھر ڈاٹ کام، اُردو بک لنک ڈاٹ بلاگسپاٹ ڈاٹ کام وغیرہ پر پہنچ کر طلبا کو درسی مواد فراہم کیا جاسکتا ہے تاکہ طلباء مستقبل میں انہیں استعمال کرتے رہیں۔ اسکالرز بھی آن لائن اُردو ادب سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے تحقیق و تنقید میں عملی کام کریں۔ 'وکی بکس بھی ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں ہم اپنی کتابیں یا مضامین ڈیجیٹلائز کرسکتے ہیں۔ اب تو اردو میں مختلف سائٹس ہیں جہاں صرف اردو کی کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ ٹاک ٹو بکس' گوگل کا اب تک کا سب سے مؤثر ٹول ہے۔

آن لائن خبریں Google E News:

عہد حاضر میں صحافت نے ٹکنالوجی کی مدد سے اپنا بلند کردار ادا کیا ہے۔ ہم ٹی وی یا موبائیل پر نہ صرف خبروں سے استفادہ کرسکتے ہیں بلکہ اردو پروگرامس اردو چینلس بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ای ٹی وی اردو، سہارا کا عالمی اردو چینل، زی نیٹ ورک کا زی سلام اور منصف اردو چینل، سیاست اُردو چینل وغیرہ موجودہ دور کے قاری کو اپنی گونا گوں خدمات سے مستفید کروارہے ہیں۔ آن لائن اخبارات بھی گھر بیٹھے اپنے موبائل فون پر پڑھ سکتے ہیں۔ آج کل واٹس ایپ پر ڈیجیٹلائیز ڈ اخبارات کو فراہم کیا جارہا ہے۔ ان اخبارات کو طلباء کے گروپس میں شیئر کریں۔ ریسرچ اسکالرز کو ایسے تحقیقی رسائل و جرائد شیئر کریں جو انہیں تحقیقی میدان میں مددگار ثابت ہوں۔

گوگل ترجمہ Google Translater:

موجودہ دور میں کسی بھی لفظ کے معنی کے لیے لغات کی تلاش ضروری نہیں۔ ہم انٹرنیٹ پر گوگل کے ذریعہ ہر زبان میں معنی معلوم کرسکتے ہیں۔ یا کسی متن کو ٹرانسلیشن میں جمع کرکے جس زبان میں چاہے مفہوم حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ ایک مترجم سافٹ ویر ہے جو ایک زبان کے متن یا وقوع رابطی مواد کا دوسری زبان میں ترجمہ کرتا ہے۔ یہ گوگل مرافقہ کی

www.urduacademyts.com

طرف سے مہیا کردہ صفحہ ہے جس کے لیے گوگل کا اپنا مترجم سافٹ ویئر استعمال کرتا ہے جو میکانیکی ترجمات تخلیق کرتا ہے۔اس میں یہ بھی ممکن ہے کہ مآخذ زبان میں تلاش کیا جائے جو پہلے منتخب زبان ترجمہ ہوتا ہے اور صارف کو مآخذ زبان سے منتخب زبان میں معائنہ اور تشریح کرنے کی سہولت دیتا ہے گوگل پر ترجمہ نگاری پر مشتمل بہت سارے ایپس موجود ہیں جس کے ذریعہ بہ آسانی اُردو سے دیگر زبانوں میں ترجمہ کرسکتے ہیں ۔بعض اوقات کچھ انفارمیشن ایسی ہوتی ہے جو اُردو میں موجود نہیں ہوتی لیکن دوسری زبان میں ہوتی ہے۔ تب ایسے وقت اساتذہ وطلباء کو چاہیے کہ وہ ٹرانسلیٹر کا استعمال کرتے ہوئے جس زبان میں چاہے ڈاؤن لوڈ کرلیں بعد میں اس کا ترجمہ کرکے اپنے لیے کارآمد بنائیں ۔عام معلومات ۔حالاتِ حاضرہ پر کچھ مواد چاہیے جو کہ اُردو میں موجود نہیں تب ایسے وقت میں گوگل ٹرانسلیٹر کے ذریعہ اساتذہ ترجمہ نگاری میں طلبا کی رہبری کرسکتے ہیں۔گوگل سے اُردو ترجمہ پر مشتمل ایپ ڈاؤن لوڈ کرسکتے ہیں ۔گوگل ترجمہ کے ذریعہ ہم کسی بھی زبان کو سیکھ سکتے ہیں بہت ساری ڈکشنریز آن لائن موجود ہیں جیسے Urdu Oxford Living Dictrioneries اسی طرح سے تلفظ کے لیے گوگل کا /pronunciation/gu:gel پر معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

خلاصۂ مضمون:

اکیسویں صدی نہ صرف دیگر زبان وادب کے لئے جدید ٹکنالوجی کے ذریعہ ترقی کا باعث بن چکی ہے بلکہ اردو ادب بھی جدید ٹکنالوجی کے نک سک سے لیس ہوکر دیگر زبانوں سے قدم ملاکر ترقی کی راہوں میں آگے ہے۔جس سے ادب سے جڑے افراد کو اس سے فائدہ ہونے لگا ہے۔ لیکن ان امکانات پر اطمینان کرنے کی بجائے عملی طور پر درس وتدریس کو جدیدیت سے جوڑتے ہوئے اساتذہ کو مزید محنت کرنی ہوگی ۔اس کے لئے اردو کی کتابوں کو ڈیجاٹلائیز کرنا ہوگا ۔اساتذہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ طلباء کو انٹرنیٹ سے جوڑے رکھیں ۔انہیں مشہور شعراء وادیب کے بارے میں تفصیلات کے علاوہ ڈاکیومنٹریز انٹرویوز وغیرہ شیر کرتے رہیں۔انہیں چھوٹی فلمیں یا ڈاکیومنٹریز بنانے کی ترغیب دیں۔ویکیپیڈیا پر اُردو شعراء وادباء کے سوانحی کوائف اور ان کے ادبی مواد کے شامل کرنے میں طلباء کی ہمت افزائی کریں اور ایسے طلباء جو کم تعلیمی استعداد رکھتے ہوں انہیں ویکی پیڈیا پر اردو کا مواد حاصل کرنے کی تربیت دیں۔مثال کے طور پر مرزا غالب کے بارے میں معلومات بہم پہنچانا ہے تو ہمیں چاہیے کہ طلباء کو اس کا طریقہ بتائیں تاکہ جس وقت اور جس موقع پر انہیں ضرورت ہو وہ ڈاؤن لوڈ کرسکتے ہیں۔ اساتذہ بھی ویکیپیڈیا میں کسی بھی شاعر یا ادیب یا کسی مضمون کو شامل کرسکتے ہیں ۔مواد کو شامل کرکے آن لائن اُردو ذخیرے میں اضافہ کرسکتے ہیں ۔اساتذہ طلباء کے ذوق کے مطابق قدیم شعراء وادیبوں پر بنائی گئیں فلمیں طلباء کو دکھائیں ۔طلباء کی نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں پر توجہ دیں۔ فلمیں گیت اور ویڈیوز یا

www.urduacademyts.com

آڈیوز کے ذریعہ معلومات بہم پہنچائیں۔ پھر دیکھیں کہ گوگل کے ذریعہ اُردو ادب کی تدریس کتنی اثر انگیز ثابت ہوسکتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدید ٹکنالوجی اور انٹرنیٹ نے جہاں زندگی کے دیگر شعبوں کو ترقی دی ہے وہیں اردو زبان وادب کو بھی ایک اہم مقام عطا کیا ہے اس نے زبان وثقافت کے حوالے سے مستقبل کے نئے امکانات روشن کیے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ٹکنالوجی استاد کا متبادل نہیں ہوسکتی۔

"عصرِ حاضر میں اُردو زبان و ادب کا فروغ : مسائل اور امکانات" کے عنوان پر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈمی کا منعقد کردہ ویبینار موجودہ دور کی ایک اہم پیش رفت ہے۔ اکیڈمی کے صدر، سکریٹری، اور منتظمین ودیگر ذمہ داران مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان سب کی انتھک کاوشوں کی بدولت اس ویبینار کی کامیاب پیش کشی ممکن ہوئی۔ محبانِ اُردو سے التماس ہے کہ اُردو اساتذہ کی تربیت کے لیے گوگل سے متعلق آن لائن ٹریننگ ویبینارز کا انعقاد عمل میں لاتے رہیں تاکہ انہیں پیشہ ورانہ ٹریننگ سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اپنے طلباء کی تعلیمی استعداد میں اضافہ کا باعث بنیں۔ NCERT دہلی کی جانب سے گوگل سے فراہم کردہ تمام تکنیکی عوامل پر آن لائن ویبنارز منعقد کیے جارہے ہیں۔ ای سرٹیفکیٹ کے ذریعہ ویبینارز میں شریک اساتذہ کی ہمت افزائی کی جارہی ہے۔ اسی طرح سے مختلف یونیورسٹیز اور کالجس کے ذمہ داران آئے دن ویبینارز منعقد کرتے رہتے ہیں۔ اساتذہ سے میری پرخلوص گزارش ہے کہ وہ ان ویبینارز کا حصہ بنیں۔ اب نئی قومی تعلیمی پالیسی کو عملی جامہ پہنایا جارہا ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ پالیسی کے اہم نکات کو پڑھیں تاکہ پالیسی کے عملی اقدامات کے بعد نہ صرف اساتذہ بلکہ طلباء بھی جدید تعلیمی نظام سے ہم آہنگ ہوسکیں۔

کتابیات:

اردو زبان کے نئے تکنیکی وسائل اور امکانات : از پروفیسر خواجہ اکرام الدین

مکمل کمپیوٹر ٹریننگ گائیڈ از شفقت علی

اپنی ویب سائیٹ خود بنائیں۔ ترجمہ شدہ یاسر جواد

urdu wikipaedia the free encyclopaedia

www.youtube.com

www.rekhta.com

www.bbcurdu.com

www.bazmesahara.com

www.jadeedadab.com

www.sherosokhan.com

www.hindsamachar.com

☆☆☆

ڈاکٹر عائشہ بیگم

صدر شعبۂ اُردو

گورنمنٹ ڈگری کالج، ظہیرآباد

ضلع سنگاریڈی۔ ریاست تلنگانہ .502220

Mobile: 9849896815

www.urduacademyts.com

ڈاکٹر محمد خواجہ مخدوم محی الدین

معاشرہ پر ذرائع ابلاغ کا اثر

انسان اپنی فطرت کا اظہار ایک ایسی تنظیم کی تشکیل اور مکرر تشکیل کے ذریعہ کرتے ہیں، جو کئی طرح سے اُن کے طرزِ عمل کی رہنمائی کرتی ہے اور اسے کنٹرول بھی کرتی ہے۔ یہ تنظیم انسانوں کی سرگرمیوں کو آزادی دلاتی ہے اور اُن کو محدود بھی رکھتی ہے ، اُن کی تعمیل اور انھیں برقرار رکھنے کے لیے معیارات طے کرتی ہے۔ اس نے انسانی تاریخ میں جو بھی خامیوں اور ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا ہے ، وہ زندگی کی تکمیل کی لازمی شرط ہے۔ یہ تنظیم جو ہر فرد کی زندگی کی تکمیل کی ذمہ دار ہے اسے ہی معاشرہ یا سماج کہا جاتا ہے۔ ہر معاشرے میں انسان کسی نہ کسی مسئلہ سے دوچار ہوا ہے۔ جدید معاشروں میں انسان مختلف پریشانیوں کا بھی سامنا کر رہے ہیں اور اُس کا برتاؤ بہت سی چیزوں سے متاثر ہوتا ہے ، میڈیا اُن میں سے ہے۔ اجتماعی ذرائع ابلاغ ہمارے فرصت کے وقت کا بڑا حصہ لے لیتے ہیں۔ لوگ ہر ہفتے اوسطاً 25 گھنٹے ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں اور انہیں ریڈیو، سنیما ، رسالوں اور اخباروں کے لیے بھی وقت مل جاتا ہے۔ بچوں کے معاملے میں ٹیلی ویژن دیکھنے پر اسی طرح کا وقت صَرف ہوتا ہے جس طرح اسکول میں یا فیملی اور دوستوں کے ساتھ وقت لگتا ہے۔ اگرچہ اسکول، گھر اور دوست یہ سب بچوں پر بڑے سماجی اثر ڈالنے والے عناصر کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن بہت بڑی بحث مجموعی میڈیا کے ممکنہ اثرات پر ہوتی ہے اور اخذ کردہ نتائج اس کے حق میں اور اس کے مخالف دونوں نوعیت کے ہیں۔ اثرات کا معاملہ عام طور پر اکیڈمک ایجنڈے (تعلیمی پیش نامہ) کی بجائے عوام سے کوئی ہنگامی ماخذ کے ساتھ اور سادگی سے اٹھایا جاتا ہے جو مسائل کی پیچیدگی کے لیے نامناسب ہے۔ (ہم دوسرے معاشرتی اثرات کے بارے میں نہیں پوچھ رہے ہیں کہ والدین کا بچوں پر کیا اثر ہے یا اسکولوں کا کیا اثر پڑتا ہے جو گھروں کے لیے عمومی بات ہے اور نہ ہی دوستوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جن کے مثبت یا منفی اثرات پڑتے ہیں)۔

میڈیا اور معاشرے کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ معاشرے پر میڈیا کے وسیع اثر کو اِن دنوں آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ میڈیا ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے، یہ کس طرح کام کرتا ہے اور یہ کن چیزوں پر مشتمل ہے۔ تکنیکی شعبے میں ترقی کے ساتھ ، ہمارے معاشرے نے بھی لوگوں کے افکار اور نظریات میں اضافہ دیکھا ہے۔ ہمارے معاشرے نے پرنٹنگ پریس سے تازہ ترین اسمارٹ فونس تک شروع ہونے والی ہر ایک ایجاد کو قبول کرلیا ہے۔ پہلے لوگ خاکہ اور پرنٹ فارم کی مدد سے ترسیل کیا کرتے تھے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ یہ واسطہ زیادہ عصری بن گیا۔

www.urduacademyts.com

آج لوگ انٹرنیٹ پر دستیاب کوئی بھی معلومات سے صرف ایک کلک دور ہیں۔ میڈیا کی مختلف قسمیں ہیں جو ہمارے معاشرے کو آگاہی، تعلیم اور تفریح فراہم کرنے میں معاون ہیں۔ میڈیا طباعت کی شکل میں ہوسکتا ہے جو اخبارات، کتابوں، رسائل وغیرہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ میڈیا میں ایسی الیکٹرانک شکل شامل ہے جو معلومات کو پھیلاتی ہے جو اجتماعی ترسیل کے سب سے زیادہ استعمال ہونے والے ذرائع ابلاغ میں سے ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کی مدد سے سامعین اور ناظرین نہ صرف تازہ جانکاری سے واقف ہوجاتے ہیں بلکہ اس سے موجودہ حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ آڈیو میڈیم کے طور پر ریڈیو ہمارے ملک کے ہر گوشے اور کونے تک معلومات پھیلانے میں مدد دیتا ہے۔ تخیل کا پلیٹ فارم بنانے میں بھی ریڈیو نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

سوشیل میڈیا اِن دنوں ذرائع ابلاغ کا سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ زیر استعمال گوشہ بن رہا ہے۔ سوشیل میڈیا مختلف لوگوں کو مختلف جغرافیائی علاقوں سے ایک پلیٹ فارم پر لے آیا ہے جس پر وہ اپنے احساسات، خیالات، جذبات، معلومات اور بہت کچھ شیئر کرسکتے ہیں۔ طرح طرح کی سوشیل نیٹ ورکنگ سائٹس جیسے فیس بک، واٹس ایپ، اِنسٹاگرام، ٹویٹر، لِنک ڈان، اور دیگر یکساں پلیٹ فارم پر نظریات، خیالات اور افکار کا تبادلہ کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ہی دنیا میں سب ایک دوسرے سے قریب آچکے ہیں۔ آج لوگوں کو پھیلاؤ کے عمل کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ شرط ایسی ہے کہ سوشیل میڈیا کا ہر صارف خود ہی معلومات کا ذریعہ بن گیا ہے۔ روزانہ کے خبریں اور آراء جن سے سوشیل میڈیا کے صارف کا سابقہ پڑتا ہے، اُس میں وسیع تر موضوعات کا احاطہ ہوجاتا ہے۔ یہ عنوانات یا مضامین ہمارے آس پاس کے واقعات سے متعلق ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی پسندیدگی یا اپنے جذبات کا اظہار متعلقہ علامتوں کی طویل فہرست کے ذریعے کرسکتے ہیں، یا اس کی مطابقت میں تبصرے بھی کرسکتے ہیں۔ سوشیل میڈیا، چھتری کے مانند کام کرتا ہے جو طرح طرح کی دلچسپ خصوصیات کی حامل ہے جس نے ہماری زندگی کو کافی آسان بنا دیا ہے۔ دوستوں کو ٹیگ کرنے (جوڑنے)، اپنے مقام سے واقف کرانا، فوٹو اور ویڈیو اَپ لوڈ کرنے، میسج چیٹنگ (تحریر کے ذریعے گفتگو)، ویڈیو کالنگ، دوستوں کو تلاش کرنا وغیرہ جیسی خصوصیات نے ہماری زندگی کو مزید دلچسپ اور پُرکشش بنادیا ہے۔

میڈیا معاشرے پر مثبت اور منفی اثر ڈالتا ہے۔ یہ نسل در نسل عوام پر اثر ڈالتا آرہا ہے۔ آج کل، جھوٹی خبریں معاشرے کو متاثر کرتی ہیں اور عوام کو جرائم کا ارتکاب کرنے پر اُکساتی ہیں۔ لوگ حساس معاملات پر کچھ خاص سوچے سمجھے بغیر تیزی سے ردعمل ظاہر کرتے

www.urduacademyts.com

ہیں۔فیس بک،ٹویٹر، واٹس ایپ جیسے سوشیل میڈیا کا جھوٹی خبریں پھیلانے کے نمایاں ذرائع ابلاغ ہیں۔ ہندوستان میں حال ہی میں جھوٹی خبر نے ایک گاؤں کے لوگوں کے ہاتھوں ایک بے گناہ شخص کو ہلاک اور اُس کے دوست کو زخمی کرادیا۔ جھوٹی خبریں غلط معلومات کے پھیلاؤ کا سادہ اثر بھی رکھتی ہیں یا نفرت انگیز پروپگنڈے کی وجہ سے خطرناک بھی ہوسکتی ہیں۔ مفادات حاصلہ کے حامل بعض عناصر کے ذریعہ جھوٹی خبریں پھیلانا معاشرے میں خلل پیدا کررہا ہے۔

آج کی دنیا میں میڈیا کرۂ ارض پر سب سے طاقتور چیز ہے۔ ذرائع ابلاغ میں اتنی طاقت ہے کہ وہ بے قصوروں کو مجرم بنائیں اور مجرموں کو بے قصور بنائیں، اور یہی کچھ تو طاقت ہے کیوں کہ وہ عوام کے ذہنوں پر قابو رکھتے ہیں۔ لہٰذا، لوگوں کے ذہنوں پر قابو رکھنا لوگوں پر ہی منحصر ہے۔ اور وہ فیصلہ کریں کہ کیا صحیح ہے۔ اس کے لیے سوشیل میڈیا حتمی برابری کرنے والا ہے۔ یہ مشغولیت یا شراکت کے خواہشمند ہر فرد کو آواز اور پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد خواجہ مخدوم محی الدین

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد

Phone No. 9849402769

بیان تفصیلات وملکیت بابتہ

ماہنامہ ''قومی زبان'' حیدرآباد

فارم 4، رول نمبر 8

RNI REGN.: TELURD/2015/32622

۱۔ مقام اشاعت : دفتر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی
چوتھی منزل، حج ہاؤز، ناملی
حیدرآباد (تلنگانہ)

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہنامہ

۳۔ نام طابع : شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس

قومیت : ہندوستانی

پتہ : چوتھی منزل، حج ہاؤز، ناملی
حیدرآباد (تلنگانہ)

۴۔ نام ناشر : شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس

قومیت : ہندوستانی

پتہ : چوتھی منزل، حج ہاؤز، ناملی
حیدرآباد (تلنگانہ)

۵۔ نام ایڈیٹر : شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس

قومیت : ہندوستانی

پتہ : چوتھی منزل، حج ہاؤز، ناملی
حیدرآباد (تلنگانہ)

۶۔ ان افراد کے نام اور پتے جو رسالے کے مالک اور شرکاء یا حصہ دار ہیں اور جن کا حصہ جملہ سرمایہ کا ایک فیصد ہو: کوئی نہیں منکہ طابع، ناشر و ایڈیٹر ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کی حد تک صحیح ہیں۔

مورخہ: یکم مارچ 2022

شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس
ایڈیٹر، ناشر و طابع

www.urduacademyts.com

تاریخ دکن کے چند اہم مصادر

اسلام کی آمد کے ساتھ ہی علم تاریخ کے میدان میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی اور روایتی تاریخ گوئی میں فصاحت وبلاغت سے لبریز دلکش طرز بیان کے ساتھ اخبار و روایات کی صحت وثقاہت کا اہتمام کیا جانے لگا اور عربی زبان میں علم حدیث کے علاوہ سیرت ومغازی اور علم انساب وتاریخ میں کئی اہم کتابیں وجود میں آئیں جو اپنی صحت وسند کے بلند معیار کی وجہ سے اعلی درجے کے مصادر ومراجع شمار کیے جاتے ہیں۔ جن میں ابن مسعودی کی التنبیہ والاشراف، ابن جریر طبری کی تاریخ الامم والملوک، ابن مسکویہ کی تجارب الامم اور ابن خلدون کی تاریخ ابن خلدون قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان میں ترک حکومت کے قیام کے بعد فارسی زبان وادب کے اثرات نمایاں ہونے لگے جنہیں ایران اور وسط ایشیا سے ہجرت کرنے والے علما و دانشوارن نے فروغ دیا اور تاریخ نگاری کی فارسی روایت کو پروان چڑھایا اور فن تاریخ میں عام تاریخ اور معاصر سلاطین وامرا کی تاریخ کے علاوہ علاقائی تاریخ لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس پیش رفت کی وجہ سے ہندوستانی تاریخ میں کئی گراں قدر علمی تاریخی سرمایے وجود میں آئے جو مختلف علاقوں اور خطوں سے متعلق ہیں اور اپنی سند وصحت کے بلند معیار کی وجہ سے علاقائی تاریخ میں بنیادی مآخذ ومرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار یورپین مورخ پروفیسر ہنری ہربرٹ ڈوڈویل نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اسلام کی آمد کے بعد ہندوستان میں ایسی مسلم تاریخیں وجود میں آئیں جو خود ہماری عہد وسطی کی یورپین تواریخ سے بدرجہا اعلی مرتبہ کی حامل ہیں۔ یہ تاریخیں، ہماری تاریخوں کی طرح خانقاہوں اور گرجوں کے راہبوں نے نہیں لکھیں، بلکہ ان لوگوں نے لکھی تھیں جو بذات خود حکومت کے کاموں میں شریک تھے، اور اکثر و بیشتر معاصر تھے۔ انہوں نے ان واقعات کو خود اپنی نگاہوں سے دیکھا تھا یا بنفس نفیس ان مہمات میں شریک تھے۔۔۔ ہندوستان کی تاریخ کا مسلم دور جیتی جاگتی شخصیات کا مرقع پیش کرتا ہے'' ۔[1]

ہندوستان کے دور وسطی میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں مورخین کی انفرادی دلچسپی کے علاوہ سرکاری سرپرستی، بادشاہوں کی ذاتی خواہش وفرمائش اور حصول خوشنودی جیسے عوامل شامل تھے۔ چنانچہ سرکاری سرپرستی اور سلاطین کی ذاتی خواہش پر لکھی جانے والی تاریخی تصانیف عام طور سے انہیں کے کارناموں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود تاریخی حقائق اور واقعات کے لحاظ سے مستند تھیں۔

ہندوستان کے وسیع تر علاقہ دکن میں یکے بعد دیگرے مختلف خودمختار سلطنتیں جیسے بہمنی سلطنت، برید شاہی، عماد شاہی، نظام شاہی، عادل شاہی اور آصف جاہی وجود میں آئیں۔ ان خودمختار سلطنتوں کے دور میں ایسے بہت سے سرکاری، غیر سرکاری مورخین اور سوانح نگار ملتے ہیں، جنہوں نے معاصر تاریخیں تحریر کیں۔ ان کی تحریریں نہ صرف سلاطین

www.urduacademyts.com

کی فتوحات ،سیاسی کشمکس ،شاہی تزک و احتشام ،درباری شان وشوکت اور عمارتوں کی عظمت کی عکاس ہیں بلکہ دکنی معاشرے کی تہذیب وتمدن کا آئینہ بھی ہیں۔

دکن کی خود مختار سلطنتوں کا دور تاریخی کتب، روزنامچے، مستند دستاویز، آثار قدیمہ اور دیگر شواہد سے مالا مال ہے۔اس دور میں لکھی گئی تاریخی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین نے اپنے فن پر انتہائی سنجیدگی سے کام کیا ہے اور ایک معتبر و مستند تاریخی مواد آنے والی نسلوں کے لئے فراہم کیا ہے۔انہیں میں سے چند تاریخی مصادر اور ان کے مورخین کا ایک مختصر جامع تعارف ذیل میں پیش ہے:

برہان مآثر:

'برہان مآثر' دکن کی تاریخ پر ایک مستند کتاب ہے جو بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں بہمنی سلاطین اور نظام شاہی کی تفصیلی تاریخ ہے۔تاریخ فرشتہ کے مطابق عام طور پر اس کو 'وقائع نظام شاہیہ' کہتے تھے، البتہ اس کا تاریخی نام 'برہان مآثر' ہے۔اس کے مصنف علی بن عزیز اللہ طباطبائی ہیں جو گیلان (عراق) سے ہندوستان آئے اور ابراہیم قطب شاہ کی ملازمت اختیار کی۔انہوں نے قطب شاہی ملازمت ترک کرنے کے بعد نظام شاہی ملازمت اختیار کر لی۔برہان نظام شاہ دوم (۹۵-۱۵۹۱ء) نے روزنامچے کی تالیف کا کام ان کے سپرد کیا۔اس روزنامچے کا نام برہان نظام شاہ کے نام پر رکھا گیا جو برہان مآثر کے نام سے مشہور ہوا۔مصنف نے یہ کتاب ۱۰۰۴ھ مطابق ۱۵۹۶ء میں مکمل کی۔اس کتاب کی اہمیت کے تعلق سے ایچ کے شیروانی لکھتے ہیں۔

''یہ بات لائق توجہ ہے کہ برہان ماثر وہ پہلا فارسی روزنامچہ ہے جس کا تعلق قطب شاہی دور کی تاریخ سے ہے اور جو دکن میں تالیف کیا گیا'' [۲]

یہ تاریخ تین مختلف دارالسلطنتوں کے لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم ہے۔طبقہ اول میں سلاطین احسن آباد گلبرگہ کا ذکر ہے۔طبقہ ثانی کا خاص موضوع سلاطین محمد آباد بیدر ہے۔طبقہ ثالث میں سلاطین احمد نگر کا ۱۴/مارچ ۱۵۹۶ء تک کا ذکر ہے۔مصنف چونکہ احمد نگر منتقل ہونے سے قبل قطب شاہی ملازم تھے،اس لئے انہوں نے گولکنڈہ، حیدرآباد کی تاریخ پر بڑی توجہ دی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مصنف اپنے وقت کا ایک ماہر ادیب ہے کیونکہ کتاب کی ابتداء سے انتہاء تک یکساں ادیبانہ طرز تحریر موجود ہے۔یہ کتاب دکن کی تاریخ نگاری کے لئے بہترین مواد فراہم کرتی ہے۔اس کتاب میں آخر کے تمام واقعات مصنف کے چشم دید ہیں۔چنانچہ یہ کتاب دکن کی تاریخی مصادر میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

تاریخ فرشتہ (گلشن ابراہیمی):

اس کتاب کے مصنف محمد قاسم بن غلام علی ہندو شاہ ہیں اور ان کا لقب فرشتہ ہے، یہ ۱۵۵۲ء میں ایران کے استر آباد کے مقام پر پیدا ہوئے اور بچپن میں ہی اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آکر احمد نگر میں سکونت اختیار کر لی۔اس وقت

www.urduacademyts.com

احمد نگر میں مرتضی نظام شاہ کی حکومت تھی۔ وہ اپنے والد کے ساتھ دربار میں رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ پھر وہاں سے بیجاپور منتقل ہوگئے اور عادل شاہی دربار میں رسائی حاصل کرلی۔ اور بیجاپور میں ہی ۱۶۲۳ء میں ان کی وفات ہوگئی۔

ان کی شہرہ آفاق کتاب 'گلشن ابراہیمی' یا 'نورسی نامہ' ہے جو تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے، جسے انہوں نے سلطان ابراہیم عادل شاہ کے حکم سے لکھنا شروع کیا۔ یہ معروف تصنیف ۱۶۰۶ء میں مکمل ہوئی اور سلطان کی خدمت میں پیش کی گئی۔ یہ تاریخ ہند کے عہد وسطی پر لکھے جانے والے اہم ترین روزنامچوں میں سے ایک ہے۔ مصنف نے تمہید میں ان ۳۲ کتابوں کا ذکر کیا ہے جنہیں مراجع اور مصادر کے طور پر استعمال کیا ہے۔

محمد قاسم فرشتہ نے اپنی اس مایہ ناز تصنیف کو ایک مقدمہ، بارہ مقالے اور ایک خاتمہ میں تقسیم کیا ہے۔ مقدمہ میں راجگان ہنوداور ہندوستان میں اسلام کی آمد وظہور کی کیفیات کا بیان ہے۔ مقالہ اول میں سلاطین لاہور کا تذکرہ ہے۔ مقالہ دوم میں سلاطین دہلی کا ذکر ہے جو سلطان شہاب الدین غوری کی فتح شمالی ہند سے مغل بادشاہ اکبر کی وفات تک کی تاریخ پر مبنی ہے۔ مقالہ سوم میں سلاطین دکن کا بیان ہے۔ مقالہ چہارم میں شاہان گجرات کا تذکرہ ہے۔ مقالہ پنجم شاہان مالوہ کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ مقالہ ششم میں سلاطین خاندیس کی تاریخ رقم ہے۔ مقالہ ہفتم میں سلاطین بنگال اور سلاطین جونپور کا بیان ہے۔ مقالہ ہشتم میں سلاطین ملتان کی تاریخ ہے۔ مقالہ نہم میں سلاطین سندھ کی تاریخ رقم ہے۔ مقالہ دہم میں سلاطین کشمیر کا مفصل بیان ہے۔ مقالہ یازدہم میں مالابار کے حکام اور ہندوستان میں پرتگیزوں کی آمد اور ان کی کیفیات درج ہیں۔ مقالہ دوازدہم میں ہندوستان کے بزرگان دین اور مشائخ کے حالات مذکور ہیں۔

اس کتاب کی تدوین میں مصنف نے قابل اعتماد واقعات کو ترجیح دی ہے اور واقعات کی پیشکش میں شہادت و استدلال اور غیر جانبداری کا اہتمام کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بعد کے مورخین نے اس سے استدلال کیا ہے۔ اس کتاب کے متعدد انگریزی اور اردو ترجمے شائع ہوچکے ہیں جو دستیاب ہیں۔

تذکرۃ الملوک:

'تذکرۃ الملوک' کے مصنف میر رفیع الدین ابراہیم بن نور الدین توفیق شیرازی ہیں۔ ان کا تعلق شیراز سے ہے۔ وہ محمود شاہ بہمنی کے زمانے میں اپنے والد کے ساتھ تاجر کی حیثیت سے بیجاپور آئے، اور علی عادل شاہ اول کے دربار میں خوان سالار یا شاہی خاندان کے سامان کے مہتمم منتخب ہوئے۔ بتدریج ان کی ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۶۲۶-۱۵۷۹ء) کے زمانہ میں بحیثیت سفیر نظام شاہی دربار میں بھیجے گئے اور واپس آنے کے بعد دارالضرب کے مہتمم بنائے گئے۔

www.urduacademyts.com

رفیع الدین نے ۹۱ر رمضان ۱۰۱۷ھ مطابق ۱۷ر دسمبر ۱۶۰۸ء سے اپنی کتاب تذکرۃ الملوک لکھنے کی ابتداء کی اور ۶ر جمادی الثانی ۱۰۲۴ھ مطابق ۲۳ر جون ۱۶۱۵ء کو اسے مکمل کیا۔ یہ کتاب بنیادی طور پر عادل شاہی سلاطین کی تاریخ پر مشتمل ہے جس میں سلاطین بہمنیہ کی ابتدا سے ۱۰۲۰ھ تک کی تاریخ درج ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے ہم عصر سلاطین (جو ہندوستان ودکن اور ایران میں بر سرحکومت تھے) کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں سلاطین بہمنیہ کی ابتدا سے سلطان محمود شاہ کی تخت نشینی تک کی تاریخ مذکور ہے۔ باب دوم میں یوسف عادل شاہ کا تذکرہ ہے۔ باب سوم میں اسماعیل عادل شاہ کا ذکر ہے۔ باب چہارم میں ابراہیم عادل شاہ اور راجگان بیجانگر کی تاریخ درج ہے۔ باب پنجم میں علی عادل شاہ کی تاریخ تخت نشینی سے احمد نگر پر ۹۶۶ھ میں والی بیجانگر رام راج کے حملے تک کا واقعہ مذکور ہے۔ باب ششم میں سلاطین گجرات، سلاطین نظام شاہی و قطب شاہی کی تاریخ اور عہد حکومت علی عادل شاہ کے بقیہ واقعات کا تذکرہ ہے۔ باب ہفتم میں افضل خان کی سرگذشت اور علی عادل شاہ کے بقیہ واقعات کا بیان ہے۔ باب ہشتم میں ابراہیم عادل شاہ اور ابراہیم بن برہان نظام شاہ کی تاریخ مذکور ہے۔ باب نہم میں سلاطین تیموریہ کے حالات بابر سے جہانگیر کی تخت نشینی تک، سلاطین صفویہ کی مفصل تاریخ ۱۰۱۸ھ تک اور ملک عنبر وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

اس کتاب کے بارے میں ایچ، کے شیروانی لکھتے ہیں کہ ''مجموعی طور سے یہ کتاب قطب شاہی سلسلہ حکومت کے ابتدائی دور پر خاصی اچھی سند سمجھی جاتی ہے۔''[۳]

بساتین السلاطین

'بساتین السلاطین' کے مصنف محمد ابراہیم زبیری ہیں۔ ان کا تعلق بیجاپور کے خاندان زبیریہ سے ہے۔ ان کا لقب 'بادشاہ حضرت' ہے۔ انہوں نے بساتین السلاطین ۱۲۴۰ھ میں مکمل کی اور اس کے دوسال بعد ۱۲۴۲ھ میں روضۃ الاولیا مکمل کی۔ روضۃ الاولیا میں بزرگان بیجاپور کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ بساتین السلاطین میں عادل شاہی سلاطین کی تاریخ ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۲۴ء تک ہے۔ اس کتاب میں آٹھ بادشاہوں کا تذکرہ ہے جو آٹھ بساتین میں تحریر ہے۔ بستان اول میں بانی سلطنت یوسف عادل شاہ کے ۱۰۱۹ھ مطابق ۱۵۱۳ء تک کے حالات درج ہیں اور بستان دوم میں اسماعیل شاہ، بستان سوم میں ابراہیم عادل شاہ، بستان چہارم میں علی عادل شاہ اول، بستان پنجم میں ابراہیم عادل شاہ ثانی، بستان ششم میں محمد عادل شاہ، بستان ہفتم میں علی عادل شاہ ثانی، بستان ہشتم میں آخری تاجدار سکندر عادل شاہ کے عہد حکومت کے حالات وواقعات مذکور ہیں۔ عادل شاہ کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے بیجاپور پر قبصہ کرکے اسے اپنی حکومت کا ماتحت صوبہ بنالیا۔ اسی بستان میں مصنف نے اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے سے انگریزوں کے تسلط تک جو واقعات پیش آئے ان کا بھی حسب حال تذکرہ کیا ہے۔

www.urduacademyts.com

تاریخ سلطان محمد قطب شاہ:

'تاریخ سلطان محمد قطب شاہ' قطب شاہی سلاطین کی ایک جامع اور مفصل تاریخ ہے۔جس میں سلطنت کے قیام کے سال سے ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء تک کے واقعات درج ہیں۔یہ کتاب ۱۰۲۵ ھ مطابق ۱۶۱۶ء میں سلطان محمد قطب شاہ کے حکم سے تالیف کی گئی۔اس کتاب کے سرورق پر مصنف کے نام کا تحریر نہیں ہے۔ایچ کے شیروانی کے مطابق مصنف نے تمہید میں یہ لکھا ہے کہ اس کے سامنے '' اعلی حضرت کے ملازمین میں سے ایک کی'' لکھی ہوئی ایک بڑی تاریخ موجود تھی جس کوانہوں نے مختصر کیا،اور بعض ایسے حقائق کا اضافہ کیا جن کا تعلق اس دور کی تاریخ سے تھا[۴]۔بعض محققین نے اس کتاب کو ملا عرب شیرازی کی تصنیف بتایا ہے۔

یہ کتاب ایک مقدمہ، چار مقالے اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔مقدمہ میں قرایوسف ترکمانی اوران کے اخلاف واسلاف کا تذکرہ ہے۔مقالہ اول میں بانی سلطنت سلطان قلی قطب شاہ کے ۹۵۰ھ مطابق ۱۵۴۳ء تک کے حالات درج ہیں، مقالہ دوم میں سلطان جمشید قلی کی تخت نشینی کی ابتدا سے ان کی وفات تک کے واقعات کا تذکرہ ہے۔نیز ان کے صاحبزادہ سبحان قلی قطب شاہ کے حالات درج ہیں جو کہ چھ ماہ حکمرانی کے بعد معزول کردیئے گئے تھے۔ مقالہ سوم میں ابراہیم قلی قطب شاہ کے حالات زندگی اور دور حکومت کا بیان ہے، مقالہ چہارم میں سلطان ابوالفتح محمد قلی قطب شاہ کے حالات کا تذکرہ ہے۔خاتمہ میں ابوالمظفر محمد قطب شاہ کے حالات تخت نشینی سے ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء تک کا بیان ہے۔

یہ کتاب نہ صرف دربار کے حالات و واقعات ،مہمات وفتوحات کا آئینہ دار ہے بلکہ قطب شاہی سلاطین کی فلاح و بہبود کے کاموں، ان کی علمی قدردانی اور سرپرستی اور ان کی تعمیرات کی عظمت کو بھی پیش کرتا ہے۔

تاریخ سوانح دکن:

'تاریخ سوانح دکن' کو منعم خاں ہمدانی اورنگ آبادی نے ۱۱۹۷ھ میں تصنیف کیا جو نواب نظام علی خاں بہادر آصف جاہ ثانی کے درباریوں میں سے تھے۔ یہ کتاب دکن کے چھ صوبوں کے حالات، شاہان آصفیہ اوران کے امراء کے تذکرہ پر مبنی ہے۔اس کتاب میں سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ کے ساتھ ساتھ جغرافیائی احوال کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔حصہ اول میں دکن کے صوبہ جات، سرکاروں اور پرگنوں کا تفصیلی ذکر ہے۔حصہ دوم میں شاہان آصفیہ اور ان کے امراء کے احوال کا تذکرہ ہے۔اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے: '' نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں مشہور مورخ منعم خاں، قدرت جنگ منجم الدولہ کی یہ تاریخ دکن ان معتبر تاریخوں میں سے ہے،جن سے خاص طور پر دکن کے چھ صوبوں کی نسبت اہم معلومات حاصل ہوتی ہے۔''[۵]

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ دکن کی وسیع تر علاقوں

www.urduacademyts.com

کی تاریخ وتہذیب سے متعلق اہم مصادر میں مرزا ملا نظام الدین احمد بن عبداللہ شیرازی کی تصنیف 'حدیقۃ السلاطین' میر ابوالقاسم بن میر رضی الدین الموسی الشوشتری معروف بہ 'نواب میر عالم بہادر' کی کتاب 'حدیقۃ العالم' حکیم غلام حسین دہلوی (خان زماں خان) کی تصنیف گلزار آصفیہ، لالہ بچھی نارائن شفیق اورنگ آبادی کی کتاب 'مآثر آصفی' شاہ تجلی علی حیدرآبادی کی تصنیف 'آصف نامہ وغیرہ اولین حیثیت کی حامل ہیں، جو عصر حاضر میں دور وسطی کے ہندوستان اور خصوصا دکن جیسے وسیع علاقے کی تاریخ وتمدن کو سمجھنے اور اس کے متعلق ایک بہتر فہم وبصیرت پیدا کرنے میں معین ومددگار ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ ایچ۔ایچ، ڈوڈویل۔انڈیا، حصہ اول، ص۲۲۔۲۳، لندن ۱۹۳۶ء

۲۔ محبّ الحسن، ہندوستانی دور وسطی کے مورخین، ص۱۵۶۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

۳۔ ایضا، ص۱۶۲'

۴۔ ایضا، ص۱۶۲

۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، تذکرہ مخطوطات، جلد سوم، ص۳۲۰، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن، ۱۹۵۷ء

ڈاکٹر محمد عرفان احمد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

موبائل: 9010849380

سبز پتے غذائی کارخانے

درختوں پر پائے جانے والے سبز پتے غذا کی تیاری کے کارخانے کہلاتے ہیں کیسے۔ اس نکتہ کو سمجھنے سے پہلے ہمیں پودوں کے مختلف حصوں خصوصاً پتوں کی بناوٹ کو دیکھنا ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اطراف پائے جانے والے پودوں کے جسم کے کئی حصے ہوتے ہیں جن میں جڑ' تنہ' پتہ پتیاں پھل اور پھول اہم ہوتے ہیں۔ نیم' املی' آم' ببول' جامن' انگور' گلاب' دھوتر اور وغیرہ سے ہم بخوبی واقف ہیں یہ نمائندہ زہراوی پھول والے پودے ہیں۔ پتہ ڈنٹھلوں پر لگے ہوتے ہیں اور عموماً ان کا رنگ سبز ہوتا ہے یہ سبز رنگ ایک مادہ کی بدولت ہے جسے خضرہ کلوروفل' کہا جاتا ہے۔ خضرہ کی بدولت پتوں میں غذا کی تیاری کا عمل ہوتا ہے۔ کسی پتے کی بناوٹ دیکھنے پر بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ ہر پتے کا جسم ایک پھیلے ہوئے حصے پر مشتمل ہوتا ہے جسے ورقہ کہتے ہیں یہ شاخوں سے ڈنٹھل کے ذریعہ لگا رہتا ہے۔ پتے کے درمیان میں ایک موٹی رگ پائی جاتی ہے جسے درمیانی رگ کہتے ہیں تھوڑی تھوڑی دور پر درمیانی رگوں سے ثانوی رگیں نکلتی ہیں جس سے مزید چھوٹی رگیں نکلتی ہیں۔ اس طرح پورے پتے کے جسم پر رگوں کا ایک جال سا بن جاتا ہے۔ گویا یہ رگیں پتے کے ہر حصے تک پہنچ جاتی ہیں اور انہی مہین رگوں سے گزر کر پانی اور اس میں گھلے نمکیات پہنچتے ہیں۔ یہیں پر کلوروفل کا ذخیرہ ہوتا ہے اور ان سب کی مدد سے غذا کی کچھ اور شکل میں ہوتی ہے۔

oOo

www.urduacademyts.com

بہمنی دور حکومت میں علم وادب

چودھویں صدی میں ہندوستان میں دہلی سلطنت کی تغلق حکومت جب کمزور پڑی، تو مرکز کے کئی صوبوں نے خودمختاری کا اعلان کیا اور اپنے اپنے علاقوں میں آزاد حکومتیں قائم کرلیں۔ انہی میں ایک دکن میں قائم ہونے والی بہمنی حکومت بھی ہے جس نے دکن کے صوبہ کو تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کی دولت سے مالامال کردیا۔ علاء الدین حسن گنگو بہمنی (م: 1358) کے ذریعہ قائم ہونے والی اس حکومت نے 180 برس تک اپنی شان وشوکت کو برقرار رکھا۔ اس میں کل 18 حکمراں رہے۔ جب یہ حکومت زوال پذیر ہوئی تو اس کے بطن سے پانچ ریاستوں نے جنم لیا جن میں احمد نگر کی نظام شاہی، بیجاپور کی عادل شاہی، گولکنڈہ کی قطب شاہی، برار کی عماد شاہی اور بیدر کی برید شاہی سلطنتیں شامل ہیں۔ انہوں نے بھی بہمنی حکومت کی علمی وتہذیبی روایتوں کو برقرار رکھا اور اپنے اپنے خطوں میں علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کے میدانوں میں عظیم کارنامے انجام دئے۔ بہمنی حکومت میں درج ذیل سلاطین نے حکومت کی:

1- علاء الدین حسن گنگو بہمنی: 1347-1358، 2- محمد شاہ اول: 1358-1375، 3- محمد شاہ دوم: 1375-1378، 4- داؤد شاہ: 1378، 5- محمد شاہ سوم: 1378-1397، 6- غیاث الدین شاہ: 1397، 7- شمس الدین: 1397، 8- فیروز شاہ: 1397-1422، 9- احمد شاہ: 1422-1436، 10- علاء الدین احمد: 1436-1458، 11- ہمایوں شاہ: 1458-1461، 12- نظام شاہ: 1461-1463، 13- محمد شاہ: 1463-1482، 14- محمود شاہ: 1482-1518، 15- احمد شاہ دوم: 1518-1521، 16- علاء الدین شاہ دوم: 1521-1522، 17- ولی اللہ شاہ: 1522-1525، 18- کلیم اللہ شاہ: 1525-1527۔

علمی وادبی خدمات:

بہمنی سلاطین علوم سے دلچسپی رکھنے والے اور علم وعلماء کے قدردان تھے۔ علم کے ہر میدان سے انہیں دلچسپی رہی اور ادب وشاعری سے بھی ان کا گہرا ربط رہا۔ محمد تغلق کے زمانے میں دہلی سلطنت کی کمزوری اور بہمنیوں کی ابھرتی ہوئی طاقت نے علماء ومشائخ کی توجہ دکن کی طرف مرکوز کی۔ ان سلاطین نے ہند اور بیرون ہند سے آنے والے علماء کا والہانہ استقبال کیا اور انہیں اپنے درباروں کی زینت بنایا، انہیں مختلف عہدوں پر فائز کیا اور حکومت کی طرف سے قائم ہونے والے مدارس میں انہیں مختلف ذمہ داریوں پر مامور کیا۔ چنانچہ ایران، عراق، عرب اور دیگر علاقوں کے علماء، ادباء اور مختلف

www.urduacademyts.com

فنون کے ماہرین ، تاجروں و فنکاروں سے دربار بھرے رہتے تھے۔

خود بانی سلطنت علاء الدین حسن گنگو علوم وفنون کا شیدائی تھا۔ اس کا دربار علماء کی کہکشاں بنا رہتا تھا۔ مولانا لطف اللہ، حکیم نصیر الدین شیرازی، علیم الدین تبریزی وغیرہ جیسے باکمال علماء اس کے دربار کی زینت تھے۔ اس دور کے مؤرخ مولانا عصامی تھے جنھوں نے 'فتوح السلاطین' لکھی۔ اسی طرح عین الدین بیجا پوری نے قاضی منہاج الدین السراج کی طبقات ناصری پر ضمیمہ لکھا۔ سلطنت کے دوسرے حکمراں محمد شاہ کو بھی اپنے والد کی طرح علم سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ وہ خود بھی مختلف علوم کا ماہر تھا۔ اس نے علوم کی اشاعت کے لئے بہمنی سلطنت کے بڑے بڑے شہروں میں مدارس قائم کئے اور فاضل علماء کو درس وتدریس کے لئے وہاں فائز کیا۔ شیخ المشائخ زین الدین دولت آبادی، عین الدین بیجاپوری، مولانا نظام الدین برنی اور حکیم ظہیر الدین تبریزی جیسے فاضل اہل علم اس کے دربار سے وابستہ رہے۔ میر فضل اللہ انجو اسی کے زمانے میں شیراز سے دکن تشریف لائے جو فارسی اور عربی کے بلند پایہ مصنف تھے۔

محمد شاہ دوم خود بھی اچھا شاعر اور علم نواز بادشاہ تھا، وہ عربی اور فارسی کا عالم تھا۔ عالم عرب اور ایران سے شعراء کو دکن مدعو کرتا رہا، جس کی وجہ سے اس دور میں دکن علم وفن کا گہوارہ بن گیا۔ اس نے خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کو بھی دکن بلانے کی کوشش کی اور دکن کے سفری خرچ کے لیے بڑی رقم فراہم کی، لیکن وہ سمندری طوفان کی وجہ سے نہیں آسکے، اور معذرت کے طور پر ایک خوبصورت غزل لکھ کر بھیجی۔ اس نے گلبرگہ، جنیر، دابول، بیدر، ایلچ پور، دولت آباد اور قندہار (اس سے مراد مالوہ کا مشہور تاریخی شہر مانڈو یا منڈو ہے) اور دیگر علاقوں میں بکثرت مدرسے بنوائے، اور بڑی بڑی علمی شخصیات کو ان میں معلمین و مدرسین کے طور پر مامور کیا اور ان کے لئے وظائف جاری کئے۔ محمود شاہ بہمنی نے بھی تعلیم کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کو یتیموں کی تعلیم وتربیت کا بھی خاص خیال رہتا تھا، چنانچہ اس نے یتیموں کے لئے علاحدہ مدارس کا بھی انتظام کیا۔

فیروز شاہ کی منفرد علمی دلچسپیاں:

بہمنی سلاطین میں اکثریت علوم سے دلچسپی رکھنے والی اور علماء پرور تھی، لیکن ان تمام سلاطین میں علم دوستی کے حوالے سے تاج الدین فیروز شاہ کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے۔ فیروز شاہ ہند کی تاریخ میں فاضل ترین بادشاہ تھا، بچپن ہی سے اس کی بہترین تعلیم وتربیت ہوئی تھی، کافی عرصہ اس نے میر فضل اللہ شیرازی کی شاگردی کا شرف بھی حاصل کیا۔ وہ عمدہ خوشنویس تھا اور ہر روز قرآن کے ایک پارہ کا پاؤ حصہ لکھا کرتا تھا۔ وہ تفسیر قرآن، اصول قانون، حکمت وفلسفہ، صوفیانہ اصطلاحات، اقلیدس، فن مناظرہ اور ریاضیات اور نباتیات جیسے مختلف علوم وفنون کا ماہر تھا۔ علوم کے ہر شعبہ سے اسے

www.urduacademyts.com

نعمت اللہ کرمانی سے منسوب کرتے ہوئے 'نعمت آباد' رکھا۔ علاوہ ازیں اس کے دور میں بھی ایران، عراق اور عرب سے علماء کی بڑی تعداد بیدر میں جمع ہوگئی تھی۔ احمد شاہ ان علماء کی قدر کیا کرتا، انہیں انعام واکرام سے نوازتا اوران سے بھرپور استفادہ کیا کرتا تھا۔

دکن کو علمی، تہذیبی و ثقافتی بنیادوں پر کھڑا کرنے میں سلاطین بہمنیہ کے ساتھ ساتھ ان کے وزراء نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان میں میر فضل اللہ انجو اور حسن گیلانی وغیرہ کے نام کافی اہم ہیں۔ لیکن یہاں کی علمی تاریخ میں باعظمت اور مشہور نام خواجہ محمود گیلانی کا ہے جن کا عرف ان کے پیدائشی شہر 'گاواں' کے نام پر محمود گاواں ہے۔ یہ 1455ء میں ایران سے دکن آئے۔ محمود گاواں نے بہمنی سلطنت میں وزارت عظمیٰ کی خدمات انجام دیں، انھوں نے بیدر میں عظیم الشان اقامتی مدرسہ تعمیر کرایا۔ اس مدرسہ نے بیدر کی عظمت کو مزید بلند کردیا تھا۔ یہ پورا مدرسہ تین منزلہ عمارت پر مبنی تھا جو نہ صرف ایک علمی درسگاہ تھی بلکہ فن تعمیر کا بھی شاہ کار تھا۔ دور دور سے سیاح اسے دیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس مدرسہ کی مرکزی عمارت کے دونوں جانب سو سو فیٹ کے دو مینار تھے اور اس کے وسیع و عریض احاطہ میں طلبہ و مدرسین کے لئے ایک ہزار کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس احاطہ میں ایک لائبریری بھی تھی جس میں تین ہزار کتابیں موجود تھیں۔ اس عمارت کی کل لمبائی 205 فیٹ اور چوڑائی 180 فیٹ تھی۔ آج بھی اس مدرسہ کے کھنڈرات موجود ہیں، جو اس کی عظمت رفتہ کی گواہی دے رہے ہیں۔ ایک مشہور فارسی شاعر سامعی نے اپنی رباعی میں بہت خوب کہا ہے:

این مدرسہ رفیع محمود بنا
چوں کعبہ شدہ است قبلہ اہل صفا
آثار قبول بین کہ شد تاریخش
از آیت ربنا تقبل منا

ooo

محمود گاواں خصوصی طور پر کئی علوم وفنون کے ماہر تھے۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر اور عظیم انشاء پرداز تھے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ''ریاض الانشاء'' اور ان کی تصنیف ''مناظر الانشاء'' فارسی نظم ونثر میں ان کی اعلیٰ قابلیت کی آئینہ دار ہیں۔ ریاض الانشا میں بعض نادر خطوط بلند پایہ اور نامور فارسی مصنفین اور علمائے فلسفہ کے نام سے ہیں۔ اہل علم میں مولانا نورالدین احمد جامی، مشہور مورخ شرف الدین علی یزدی، صوفی بزرگ خواجہ عبیداللہ احرار اور انہی جیسے کئی دیگر اہل علم سے اپنے خطوط کے ساتھ ربط وتعلق میں تھے اور اہل سیاست وریاست میں گیلان، عراق اور عرب کے حکمراں وعہدیداروں کے ساتھ ساتھ ان کے ہم زمانہ عثمانی سلطان محمد فاتح سے بھی ان کی خط وکتابت ہوا کرتی تھی۔

مضامین

www.urduacademyts.com

علاقائی زبانوں کی سرپرستی:

بہمنی دور میں جنوبی ہند میں مختلف زبانوں کا بھی ارتقاء ہوا،ان میں فارسی، دکھنی، مرہٹی، کنڑی اور تلنگی شامل ہیں۔ کنڑی و مراٹھی زبانوں کا فروغ گرچہ بہمنی حکومت کے قیام سے پہلے ہی ہو چکا تھا،لیکن بہمنی سلطنت کی حدود میں وہ علاقے بھی شامل تھے جہاں مراٹھی و کنڑی زبانیں بولی جاتی تھیں،لہذا ان زبانوں کو بھی حکومتی سرپرستی حاصل ہوئی۔ بہمنی حکومت میں مراٹھوں کو عہدوں کی فراہمی بھی اس بات کا ثبوت ہے ۔

اُردو زبان بھی اس وقت اپنے لڑکپن کے دور میں تھی اور وہ اس وقت 'دکھنی زبان' کی قبا اوڑھے ہوئی تھی ۔اس میں فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور عربی زبان کے الفاظ بھی کثرت سے موجود تھے۔ حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی تصنیف 'معراج العاشقین' بھی دکنی زبان کی ابتدائی شکل میں ہی لکھی گئی جس میں فارسی اور سنسکرت الفاظ کے علاوہ بول چال کے کچھ الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔تصوف کے اصولوں پر موصوف کی ایک اور تصنیف 'شکار نامہ' بھی اسی لسانی طرز پر لکھی گئی ہے۔ایسے ہی احمد شاہ دوم کے دور میں 'نظامی بدری' کی لکھی مثنوی 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' کی تالیف میں بھی موصوف نے دکھنی کے ساتھ ساتھ کثرت سے سنسکرت الفاظ کو استعمال کیا۔

خلاصہ:

جنوبی ہند کی مسلم سلطنتیں ہندوستان کی مسلم تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ انھوں نے اس علاقے پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، اور آج تک اس کے آثار پائے جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کی مسلم سلطنتوں نے اس علاقے میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ انھوں نے تہذیب وتمدن کے فروغ کے ساتھ ساتھ علم اور خصوصاً ادب وشاعری اور لسانی ترقی پر بہت زیادہ توجہ دی۔ اس دور میں مراٹھا اور فارسی زبانوں کو عروج حاصل ہوا۔ اس دور میں ایران وغیرہ سے بہت سے اہل علم فضلاء نے دکن میں آکر اپنی علمی خدمات انجام دیں۔ان تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کا سہرا دکن کی مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کے سر جاتا ہے، کہ ان کی علم دوستی ہی وجہ سے دکن علم وادب کا بھی گہوارہ بنا۔

☆☆☆

ذیشان سارہ

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبہ اسلامک اسٹڈیز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

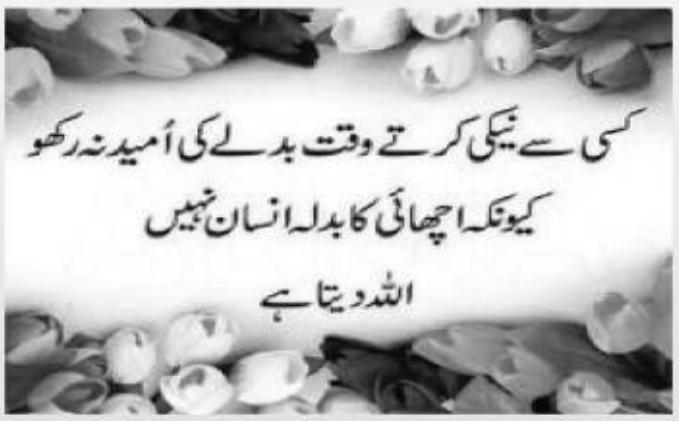

www.urduacademyts.com

ناول ''برف آشنا پرندے'' کا تہذیبی مطالعہ

وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے والی مشہور فکشن نگار ترنم ریاض اپنے منفرد اور انوکھے طرز اظہار کے لیے اردو ادب میں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔وہ اردو ادب کی ان خواتین قلم کاروں میں شمار ہوتی ہے جنہوں نے اپنی تخلیقی نگارشات سے قارئین کو بہت متاثر کیا ہے ۔ انھوں نے نہ صرف اردو فکشن میں اپنا نام بنایا بلکہ اردو شاعری سے بھی قارئین کو لطف اندوز کیا۔وہ بیک وقت ایک شاعرہ، ناول نگار، افسانہ نگار، تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین محقق اور نقاد بھی ہیں۔ان کی اب تک بارہ سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں ان کے دو ناول بھی شامل ہیں۔ تخلیق کار نے جس معاشرے میں پرورش پائی ہو، اس معاشرے کی عکاسی ان کی تصانیف میں دیکھنے کو ملتی ہے چونکہ ترنم ریاض کا تعلق وادیٔ کشمیر سے ہے،اس لیے ان کی ناولوں میں کشمیر کی تہذیب ومعاشرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہیں۔

بلاشبہ کوئی بھی قلم کار اپنے گردونواح کے حالات، واقعات اور حادثات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا اور پھر جب حالات وحوادث کی نوعیت ایسی ہو کہ اکثر شعبہ ہائے زندگی ان سے اثر انداز ہوں تو قلم کار کا متاثر ہونا یقینی ہے۔ایک حساس تخلیق کار ہونے کے ناطے ترنم ریاض بھی وادیٔ کشمیر کے حالات وواقعات سے متاثر نظر آتی ہیں۔ان کی تخلیقات میں کشمیر کی بھرپور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ترنم ریاض کے ناول ''برف آشنا پرندے'' میں شروع سے لے کر آخر تک کشمیر کی تہذیب وتمدن اور حالات وواقعات کی عکاسی بڑی فنکاری سے کی گئی ہے۔کشمیر کی تہذیب وتمدن ثقافت و معاشرت، سیاست اور تاریخی عناصر اس ناول کے اکثر صفحات پر جلوہ گر نظر آتے ہیں۔کشمیر کی طویل تاریخ کو مصنفہ نے اپنے اس ناول میں فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ پانچ سو سینتالیس صفحات پر مشتمل یہ ناول کشمیر کی تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔

چونکہ یہ ناول ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس ناول میں کشمیر کی پوری تاریخ کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے جس میں بدھ مت، ہندومت اور پھر اسلام کی آمد کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ان مختلف مذاہب کی آمد سے یہاں کی تہذیب بھی وقتاً فوقتاً متاثر ہوتی رہی۔جس کے واضح ثبوت آج بھی کشمیر میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔مثلاً کشمیر میں جگہ جگہ بدوہاروں کے کھنڈرات دیکھنے کو ملتے ہیں وغیرہ۔

جہاں تک اس ناول میں کشمیر کے تہذیبی عناصر کا تعلق ہے تو یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اس ناول میں نہ صرف موجودہ تہذیب کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ قدیم تہذیبی پیکروں کو بھی پیش کرنے میں مصنفہ کامیاب نظر آتی ہیں۔کشمیری تہذیب کی ایک نمایاں خوبی یہاں کی شادی ہے جو پورے ہندوستان سے مختلف ہوتی ہے۔یہاں کی شادی کی اپنی ایک الگ پہچان ہے اور اس کے اپنے تہذیبی پہلو ہوتے

www.urduacademyts.com

ہیں جو پوری دنیا میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ مہندی کی رات سے لے کر دلہن کی وداعی تک کشمیر کی تہذیب کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شادی کے موقعے پر عورتوں کا ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر ایک جٹ ہو کر گانا۔ یہ مخصوص گانے کورس میں گائے جاتے ہیں اور ان گانوں کے بول بھی جداگانہ ہوتے ہیں جو کشمیر کی تہذیبی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ گانے دلہے کی آمد یا دلہن کی بدائی کے وقت گائے جاتے ہیں اور وقت کی مناسبت سے گانے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ان گانوں کی کوئی تحریری شکل نہیں ملتی بلکہ یہ گانے سینہ در سینہ ایک پود سے دوسری پود تک منتقل ہوتے ہیں۔ اس پوری تہذیب کی عکاسی ترنم ریاض نے اپنے اس ناول میں کچھ اس طرح کی ہے:

''عورتیں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے چھ چھ سات سات کی تعداد میں جنگلا سا بنا ہوا پاؤں بدل بدل کر لوک گیت گایا کرتیں۔ دو جنگلے بنائے جاتے باری باری گانے کے لیے اور کبھی کبھی چار بھی۔ دولہے کے استقبال میں یا بدائی کے وقت گائے جانے والی ان نغمتوں میں اس وادی کی خوش کلام خواتین صورتحال کی مناسبت سے نغمے تراشتیں، انہیں موسیقی اور لئے بخشتیں۔'' (برف آشنا پرندے، ص ۲۱۰)

جہاں کشمیر میں گائے جانے والے گیتوں کی بات کی جاتی ہے تو وہاں کشمیر میں ''قوالوں'' کا ذکر بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کشمیری قوالی یہاں کے صوفیائے کرام سے خاص مناسبت رکھتی ہے۔ قوال اور قوالی کا تعلق کشمیر کی تہذیب سے بہت گہرا رہا ہے۔ کوئی بھی خوشی کی تقریب، عرس یا میلہ، یہاں تک کہ بچے کے منڈن جیسی تقریبات قوال اور قوالی کے بغیر نامکمل تصور کی جاتی ہیں۔ گویا قوالی کا کشمیری تہذیب سے گہرا اور بہت ہی پرانا تعلق ہے۔ ڈوگرا دورِ حکومت میں باضابطہ طور پر قوالوں کو ملازم رکھا گیا اور قوالی گھر بنائے گئے۔ تہذیب کی اس کڑی کی طرف ترنم ریاض نے بھی اپنے قلم کو جنبش بخشی اور کشمیری تہذیب کے اس پہلو کو قارئین کے گوشوں تک کچھ اس طرح پہنچایا۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''یہ فنون لطیفہ کی اس عظیم صنف، موسیقی کا کرشمہ کہ آواز، ذرا سے اتار چڑھاؤ سے کائنات بھر کا حسن سمیٹتی، بکھیرتی، کوئی ایسی فسوں کاری کرتی معلوم ہوتی ہے، جسے موسیقی سے قطعی نابلد انسان اور چرند و پرند تک کی روح پہچانے بھی لگتی ہے اور اس ماحول کا حصہ بھی ہو جاتی ہے..... صوفیوں کی درگاہوں پر قوالیوں کے الفاظ اور موسیقی سے بے خود قلوب، علمِ ارواح سے گویا جڑ جاتے ہیں اور پھر کسی کو گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں رہتی۔'' (برف آشنا پرندے، ص ۴۸۲)

ہر دور میں عورت ایک اہم موضوع رہا ہے، عورتوں کے حق میں آج پوری دنیا اپنی آواز بلند کر رہی ہے اور عورتوں کو کھلی فضا عطا کرنے کے درپہ ہے۔ عورت، اس کے وجود، اور اس کے حقوق کو بھی تہذیب کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یعنی ہر قوم کا عورتوں کے تئیں اپنا ایک مخصوص نظریہ ہوتا ہے اور اپنی واضح حد بندیاں اور معیارات ہوتے ہیں۔ گویا عورت اور تہذیب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ اب اگر کشمیر کی تہذیب

www.urduacademyts.com

میں عورتوں کے تعلق سے بات کی جائے تو اس اعتبار سے بھی یہاں کے تہذیبی پہلو انفراد کے حامل ہیں۔ کشمیری تہذیب کی یہ روایت رہ چکی ہے کہ عورتوں کا بنا پردے کے گھر سے نکلنا خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ گھر کا بزرگ ہی گھر کے سارے فیصلے لیتا ہے جس کو گھر کے ہر ایک فرد کو خوشی خوشی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ لڑکیوں کی شادی بھی یہی گھر کے بزرگ ہی اپنی مرضی کے مطابق طے کرتے ہیں۔ جس کو ہر صورت میں لڑکی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ناول میں جب فہیمہ تعلیم مکمل کرتی ہے تو اس کی شادی ڈاکٹر کے بجائے انجینئر سے طے کی جاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''فہیمہ کا گریجویشن مکمل ہو گیا تھا۔ امی اس کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ اس نے بھی آگے تعلیم جاری رکھنے کی کوئی ضد نہ کی۔۔۔ رشتہ طے ہو گیا۔ مگر لڑکا ڈاکٹر نہیں تھا۔ ایک دوسرے شہر میں انجینئر تھا۔۔۔ شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اچانک فرخندہ کے لئے بھی شادی کا پیغام آیا۔ وہ ابھی گیارہویں درجہ کی طالبہ تھی لیکن اس عمر کی لڑکیوں کی شادی رائج تھی۔'' (برف آشنا پرندے، ص ۶۷)

مذکورہ بالا اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کشمیری تہذیب میں لڑکیوں کی شادی اپنی مرضی کے بجائے گھر والوں کی مرضی سے کی جاتی تھی جس پر لڑکیاں اپنی رضا مندی ظاہر کرتی تھیں۔ ساتھ ہی اس اقتباس سے ایک اور بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کشمیر میں لڑکیوں کی شادی کم سنی میں ہی کی جاتی تھی اور یہ سلسلہ کشمیری تہذیب میں بہت ضروری سمجھا جاتا تھا اور اس روایت کو پاسداری ہر گھرانے کے لئے لازمی سمجھی جاتی تھی لیکن موجودہ دور میں اس کی مخالفت میں کم سن لڑکیوں کو شادی کے زیور پہنانے سے پہلے تعلیم کے زیورات سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

ناول کی ورق گردانی کرتے ہوئے قاری کشمیری تہذیب کے کچھ اہم گوشوں سے آگاہ ہو جاتا ہے جس میں وہاں کی شادی بھی اپنی ایک منفرد خصوصیت رکھتی ہے۔ کشمیری شادی میں مہندی کی رات سے دلہن کی وداعی تک گویا ہر معاملے میں خاص رسومات کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شادی میں پکائے جانے والی دعوت جس کو ''وازوان'' کہتے ہیں، بھی کشمیری تہذیب کی ایک نمایاں اور لاثانی کڑی ہیں۔ کشمیری ''وازوان'' دنیا بھر میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے لاثانی حیثیت رکھتا ہے۔ نہ صرف یہاں کا ''وازوان'' قابلِ توجہ ہے بلکہ دولہا اور دلہن کے حوالے سے بھی یہاں کی تہذیبی روایت کسی حد تک مختلف نظر آتی ہے۔ تہذیبی روایت کی پاس داری کرتے ہوئے اس بات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ شادی سے پہلے دولہا دلہن ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے تھے۔ نہ صرف ملنا بلکہ شادی سے قبل انہیں ایک دوسرے کو دیکھنا بھی تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح کی تہذیبی پاسداری اگرچہ زمانہ حال میں کہیں نظر نہیں آتی ہے لیکن آج بھی وہاں کے بوڑھے بزرگ اس تہذیب کے روادار ہیں۔ ناول میں اس حوالے سے خوب ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح

مضامین

www.urduacademyts.com

کی تہذیب کی پاسداری کردار شیبا کی ماں بھی کرتی نظر آتی ہے۔ملاحظہ کیجئے ناول سے یہ اقتباس:

''یعنی آپ نے ابو کا چہرا دیکھا ہی نہیں تھا۔۔۔؟

فرخندہ نے سوال کیا تھا۔

''یہی رواج تھا بیٹا۔۔۔ہونے والے دولہا دلہن ایک دوسرے کو نہیں دیکھا کرتے تھے۔۔۔میں نے تو پھر بھی ہاتھ دیکھ لیا تھا۔۔''

امی ہنس پڑی تھی۔'' (برف آشنا پرندے، ص ۵۸)

شادی بیاہ کی بات کی جائے یا شادی میں مہمانوں کے لئے خصوصی پکوان کی، یہاں کے رہن سہن کی بات جائے یا یہاں کے پوشاک کی، گویا ہر پہلو سے یہاں کی تہذیب دیگر تہذیبوں سے الگ اور منفرد ہے۔کشمیری تہذیب میں یہاں کا پہناوا بھی ایک انوکھی نوعیت کا حامل ہے۔خصوصی طور پر یہاں کا لباس جس میں ''پھرن'' قابل ذکر ہے۔''پھرن'' کشمیریوں کا خاص لباس ہے جس کی ایک خاص تہذیبی اور ثقافتی اہمیت ہے۔جغرافیائی اعتبار سے کشمیر اونچی اونچی برفیلی پہاڑیوں کے درمیان ایک خوبصورت وادی ہے جہاں سال کے چار مہینے بہت سردی رہتی ہے۔اسی یخ بستہ سردی سے بچنے کے لیے یہاں کے لوگ ایک موٹے کپڑے کا لباس پہنتے ہیں جس کو ''پھرن'' کہتے ہیں۔پھرن کے ساتھ ساتھ سردی سے بچنے کے لیے ''کانگڑی'' کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔''پھرن'' کے ساتھ ''کانگڑی'' لازم ملزوم ہے۔نہ صرف یہ بلکہ عورتوں کا بنا ''پھرن'' کے گھر سے نکلنا غیر مہذب سمجھا جاتا ہے۔ترنم ریاض چونکہ کشمیر میں ہی پلی بڑی ہیں۔اس لیے انھیں کشمیری تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے۔اس ذاتی دلچسپی اور لگاؤ کے پیش نظر ہی انھوں نے کشمیری تہذیب کے تمام تر خدوخال کو قاری کے سامنے پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔''پھرن'' اور ''کانگڑی'' کے حوالے سے مصنفہ کچھ اس طرح لکھتی ہیں:

''کانگڑی والے کی صدا کہیں دور سے آرہی تھی۔ یہ کوئی دوسرا کانگڑی والا تھا۔پہلا جو کہتا تھا اس کا ترجمہ تھا 'کانگڑی لے لو۔' اور دوسرا صرف 'کانگڑی ای ای ای' کہتا تھا۔سرما آنے والا ہے۔'' (برف آشنا پرندے، ص ۴۹۵)

اسی طرح ایک اور جگہ کچھ اس طرح لکھتی ہیں:

''جب پھر کانگڑی والا ویسے سرد موسم میں جیکٹ کے اوپر موٹے سے کپڑے کا، پٹو، ٹویڈ، یا سرینگر کے بمنہ میں قائم ملِ کا بمنہ وُول سے بنا پھرن پہنے گا اور گھنگریالے بالوں والے ماتھے سے، پیچھے کو گردن تک، کانوں کو چھپاتی ہوئی ٹوپی پہن کر ہی باہر نکلے گا۔'' (برف آشنا پرندے، ص ۴۹۶)

کشمیری تہذیب میں جہاں لباس کی بات آتی ہے تو وہی لباس کے ساتھ ساتھ چاندی کے زیورات سے دلہن کو سجانا اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔یہاں کی عورتیں زیادہ تر چاندی کے زیورات پہننا پسند کرتے ہیں۔نہ صرف چاندی کے زیورات کا پہننا بلکہ ان کا پہناوا بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔یہاں کی یہی تہذیبی روایت رہ چکی ہے کہ دلہن کو چاندی کے زیورات سے ایک منفرد انداز سے سجایا جاتا تھا۔

www.urduacademyts.com

کشمیری تہذیب کے اس پہلو کی نشاندہی ترنم ریاض کچھ اس طرح کرتی ہیں:

''اس زور سے کہ اس کے کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے بالے اس کے رخساروں کو چُھو کر رہ گئے۔اور اس کے سیاہ پھرن کے گریبان کے کنارے ٹنگے، گھنگریاں لگے چاندی کے سکے چھم چھم بج اٹھے تھے۔'' (برف آشنا پرندے،ص۲۰۵)

ان تمام تہذیبی پیکرون کے علاوہ کشمیری ''سماوار'' یہاں کی تہذیب کا ایک خاص ورثہ رہا ہے۔کشمیری سماوار اور اس میں تیار کردہ کشمیری نمکین چائے اور کسی خاص موقعے یا مہمان کے لیے بنایا جانے والا ''کہوہ'' بھی کشمیری تہذب کا ایک اہم باب رہا ہے۔گویا سماوار، نمکین چائے اور کہوہ کے بغیر کشمیری تہذیب نامکمل تصور کی جاتی ہے۔جہاں کشمیری تہذیب کی بات کی جاتی ہے وہاں سماوار، نمکین چائے اور کہوہ کی بات کرنا لازم بن جاتا ہے۔باالفاظ دیگر سماوار، نمکین چائے اور کہوہ کے بغیر کشمیری تہذیب نامکمل ہے۔مصنفہ نے بھی اپنے اس ناول میں ان کا ذکر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کچھ یوں کیا:

''سماوار میں نمکین چائے صبح سے ابل رہی تھی۔جتنا نمکین چائے ابلتی اتنی ہی ذایقہ دار ہوتی جاتی۔۔۔۔سماوار اور رکابیوں پر گل کاری کی گئی تھی۔پیالیاں اور پرچیں سفید رنگ کی تھیں۔نمکین چائے کے لیے رائج بغیر دستے والی پیالیاں (شوربہ پینے والی چینی پیالیوں جیسی مگر جسامت میں قدرے چھوٹی) استعمال نہیں ہوتی تھیں۔'' (برف آشنا پرندے،ص۱۱۲)

ان تمام تر تہذیبی پہلوؤں کے علاوہ بھی مصنفہ نے یہاں کی تہذب کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اس کی تمام تر جزئیات کو پیش کرنے کی سعی کی ہے جس میں یہاں کی دستکاری، یہاں کے دسترخوان پر بچھی مختلف نعمتیں اور اس کے علاوہ یہاں کی فرمائشی روٹیاں جن کی اپنی تہذیبی اہمیت ہے' کو اس ناول میں پیش کیا ہے۔گویا اس ناول میں مصنفہ نے کشمیری تہذیب کی ہر ایک کڑی کو اپنے قلم کی زینت بنا کر ان کی سچی اور بھرپور تصویر قاری کے سامنے رکھ دی ہے جس کا مطالعہ کر کے قاری اس تہذیب کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔سید محمد اشرف ناول ''برف اشنا پرندے'' کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''برف آشنا پرندے'' کشمیری ماحول میں زندگی گزارنے والی ایک حساس لڑکی کے نقطہ نظر سے لکھا ایک مختلف انداز کا ناول ہے۔کشمیر کے ماحول، پھول، پھل، گھاس، پرند یعنی نباتات اور حیوانات کا بے حد خوردبینی جائزہ لیا گیا ہے۔کشمیر کو مرکز بنا کر اردو میں اتنی طویل تخلیقی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔'' (سید محمد اشرف ، رسالہ بازیافت، کشمیر یونیورسٹی،۲۰۰۹،ص۲۵۷)

☆☆☆

مدثر احمد گنائی
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو یونی ورسٹی آف حیدرآباد
گچی باولی حیدرآباد۔۵۰۰۰۶۴

www.urduacademyts.com

محمد تنویر

اردو صحافت کا سفر

لفظ صحافت عربی زبان کے لفظ ''صحف'' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی صفحہ کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ جدید عربی میں صحیفہ بمعنی جریدہ اور اخبار بھی مستعمل ہے۔ جناب وارث سرہندی کی مرتبہ علمی اردو لغت (جامع) میں اس کا مطلب یہ بتایا گیا ہے ''صحیفہ سے مراد کتاب رسالہ' لکھا ہوا' اخبار' کتابچہ' وہ مختصر کتابیں جو پیغمبروں پر اللہ تعالی نے نازل فرمائیں''۔ اخبار یا رسالے کو صحافت کہتے ہیں اور اخباری زبان میں ایسا مطبوعہ مواد جو مقررہ وقفہ سے شائع ہوتا ہے۔ اسے صحیفہ کہتے ہیں۔ تمام اخبارات اور رسائل صحیفے ہیں۔ صحافت کے ذریعہ کوئی خبر اطلاع یا معلومات ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچائی جاتی ہے۔ انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے سماج، اپنے ملک اور دنیا بھر ہو رہے مختلف قسم کے واقعات، حادثات، حالات، کھیل کود وغیرہ کے بارے میں معلومات رکھے۔ بات جاننے کی انسان تجسس کی تکمیل صحافت کے ذریعہ ہوتی ہے صحافت معلومات فراہم کرنے کے ساتھ انسانی خبروں کو فروغ دینے کا کام بھی کرتے ہیں۔ صحافت کا انگریزی متبادل Journalism ہے۔ یہ لفظ Journal سے ماخوذ ہے۔ خود Journal لاطینی سے آیا ہے

انسانی سماج میں صحافت کی بہت اہمیت ہے۔ انسانی ضروریات کی تکمیل میں صحافت بھی اہم حصہ ادا کرتی ہے۔ صحافت کو کسی ملک کے مقنّنہ انتظامیہ اور عدلیہ کے بعد چوتھا اہم ستون کہا جاتا ہے۔ جمہوریت میں صحافت کا اہم مقام ہے۔ سیاست دانوں کی کارکردگی صحافت کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ صحافت کا مقابلہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ہے یہ دونوں الیکٹرانک ذرائع ابلاغ ہیں اور براہ راست معلومات فراہم کرتے ہیں۔ لیکن اخبار میں گزرے دن کے خبریں ہوتی ہیں۔ اس لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مقابلہ میں اخبار کی اہمیت کم ہوتی ہے۔ لیکن اخبار کی اہمیت اس طرح ہے کہ اسے اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے جہاں چاہے پڑھا جاسکتا ہے۔ اخبارات میں مقامی خبریں بھی شائع ہوتی ہیں اور عوامی ضرورت کی بہت سی معلومات جیسے موسم کا حال، نماز کے اوقات، ترکاری اور اجناس کی قیمتیں، سونے چاندی کا بھاؤ، ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں کی تفصیل، اہم سرکاری اعلانات، ریلوے اور ہوائی جہاز کے اوقات کی تفصیل معلوماتی اشتہارات وغیرہ ہوتے ہیں جو ریڈیو اور ٹی وی پر اکثر پیش نہیں ہوتے۔ اخبار سستا ہوتا ہے جب کہ ریڈیو، ٹی وی مہنگا ہوتا ہے۔ اس طرح صحافت کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ صحافت دنیا بھر میں ہو رہی پل پل کی خبریں لوگوں تک پہونچانے کا عمل ہے۔ آج صحافت ایک پیشہ ہی نہیں ایک مقصد ایک مشن اور ایک قسم کی تجارت ہے۔ بڑے بڑے صحافتی ادارے یوں تو لوگوں تک خبریں پہونچانے کا کام کر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کی رائے عامہ کو متاثر کرنے اور صحافت کے پیشے کے ذریعے اپنے مشن کی تکمیل اور اپنی تجارت کو فروغ دینے کا کام کر رہے ہیں۔ لوگوں تک خبریں پہونچانے کا عمل تیز تر ہوگیا ہے اور اب بدلتے حالات میں انٹرنیٹ کی سہولت سے پل پل آرہی خبروں کو فوری عوام تک پہونچانے کا کام کیا جارہا ہے۔ اس کے باوجود صحافت کے روایتی طریقے بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ صحافت چاہے پرنٹ میڈیا کی ہو یا الیکٹرانک میڈیا کی اس کے مقاصد یکساں ہیں۔

www.urduacademyts.com

ہندوستان میں طباعت کی ابتداء پرتگیزیوں نے کی۔ 1557ء میں گوا میں ہندوستان کا پہلا چھاپہ خانہ قائم ہوا۔انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی آمد کے بعد یہاں اپنا پہلا چھاپہ خانہ 1674 میں بمبئی کے مقام پر قائم کیا۔1789ء میں کولکتہ میں چھاپہ خانہ کھولا گیا۔ اسی سال جیمز اگسٹن نے کولکتہ میں اپنا چھاپہ خانہ شروع کیا۔آہستہ آہستہ ہندوستان کی دیگرزبانوں میں ٹائپ کے چھاپے خانے کام کرنے لگے۔ایک اور انگریز James Augustus Hicky نے 29 جنوری 1780ء کوکولکتہ جنرل اڈورٹائزر یا بینگ بنگال گزٹ کے نام سے انگریزی میں اخبار جاری کیا جو عام طور پر ہکی گزٹ کے نام سے مشہور ہوا۔4 مارچ 1784ء کوحکومت کی نگرانی اور سرپرستی میں کولکتہ گزٹ جاری ہوا۔اس کی ادارت مشہورادیب اورمترجم فرانسیس کلیڈون نے کی۔اس اخبار میں فارسی ادب کے شہہ پاروں کا انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا اور دیگر تہذیبی و سماجی خبریں اخبار کا حصہ ہوتی تھیں۔کولکتہ گزٹ کی فائیل سے اس عہد کے تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔اس طرح کمپنی کے عہد میں ہندوستان میں انگریزی اور بعد میں فارسی اوراردو اخبارنویسی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت ہندوستان میں فارسی زبان کا چلن عام تھاچنانچہ فارسی میں بھی اخبارات جاری ہوئے جو اردو اخبارات کے پیشرو تھے۔''مراۃ الاخبار'' مطبوعہ فارسی صحافت کا پہلا اخبار ہے جسے راجارام موہن رائے نے ۲۰/اپریل ۱۸۲۲ء کو جاری کیا۔ایک لحاظ سے یہ برصغیراورایران کا پہلا فارسی اخبار تھا۔مراۃ الاخبار میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا تھا۔

ہندوستان میں تقریباً ایک صدی تک فارسی صحافت برقرار رہی۔اس صحافت نے اپنے محدود ذرائع کے باوجود سماجی اورصحافتی نقطہ نظر سے گہرے اثرات چھوڑے۔ ہندوستان میں فارسی کے بعد اردو صحافت نے ترقی کی۔چونکہ یہ صحافت کا ابتدائی دور تھا۔اور مغلوں کی حکومت زوال پذیر تھی۔اس لئے فارسی صحافت کوحکومت کی خاطر خواہ سرپرستی نہیں مل سکی۔ادھر ہندوستان میں اردوزبان کا چلن عام ہونے لگا تھااوراردو چونکہ ایک عوامی زبان تھی اورانگریزوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی خاطر بھی اردوصحافت کے فروغ میں آسانی ہوئی۔ تاہم ہندوستان کی فارسی صحافت نے اردوصحافت کے لئے راہ ہموار کی جس پر چلتے ہوئے اردوصحافت نے خوب ترقی کی اور ہندوستان میں قومیت کے جذبے کو پروان چڑھانے اور جدوجہدآزادی کی تحریک کوعام کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

ہندوستان میں اردوصحافت کے آغاز کا سبب ہری دت کا بنگلہ اخبار ''سمواد کمودی'' تھا جو 1821ء میں جاری ہوا۔اسی درمیان اس اخبار کے معاون ایڈیٹر بھوانی چرن بندو پادھیا نے ''سماچار چندریکا'' نامی اخبار جاری کیا۔ جسے ہری ہردت نے مخالفانہ رویہ سمجھ کر اپنے لئے چیلنج سمجھا اور 27مارچ 1822ء کواردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' کے نام سے جاری کیا۔اردوصحافت کی تحقیق میں اب اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ اردو کا پہلا اوراولین اخبار ''جام جہاں نما'' ہے۔ پہلے یہ اردو میں شروع ہوا۔ پھر فارسی میں شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار بہت کم مدت تک جاری رہا۔اور یہ اخبار 23 / جنوری 1828ء میں بند کردیا گیا لیکن یہ فارسی میں اسی نام سے جاری رہا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں عملاً مرکزی حیثیت حاصل کرلی تھی اوراپنی امتیازی شان کوظاہر کرنے کے لئے مغل سرکاری زبان فارسی کو ختم کرکے 1830ء میں اردوکوسرکاری زبان کا درجہ دیا۔جس

www.urduacademyts.com

سے اردو کی نشو ونما پر خوش گوار اثرات مرتب ہوئے۔عدالتوں میں فارسی کی جگہ اردو میں کام کاج ہونے لگے ساتھ ہی ساتھ اردو اخبارات کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ 1836ء میں محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ''دہلی اردو اخبار'' جاری کیا۔یہ اخبار شمالی ہند کا پہلا اور ہندوستان کا دوسرا اخبار تھا۔اس اخبار نے جدوجہد آزادی میں بھر پور حصہ لیا۔انگریزوں کی مخالفت اور آزادی کی حمایت کرنے کی پاداش میں مولوی محمد باقر شہید کردیئے گئے۔یہ پہلے اخبار نولیس تھے جنہوں نے ملک کی آزادی کے لئے قربانی دی اور اردو کے پہلے ''شہید صحافی'' کہلائے۔سرسید کے بھائی سید محمد خاں نے 1837ء میں ''سید الاخبار'' اور ایک عیسائی مشنری سوسائٹی کے تحت مرزا پور سے ''خیر خواہ ہند'' جاری کیا۔ان تینوں اخباروں کے اجرا کے بعد شمالی ہند سے ہی نہیں بلکہ ملک کے دور دراز گوشوں سے بھی اخبارات جاری ہوئے ان میں سراج الاخبار 1841 صادق الاخبار 1844 ،عمدۃ الاخبار 1847 ، اسعدالاخبار 1847 ،تعلیم الاخبار، جام جمشید لکھنو اخبار، تحفتہ الحدائق،کوہ نور، باغ نور، ریاض نور، سحر سامری، طلسم لکھنو، وغیرہ اہم اخبارات ہیں۔ اردو صحافت کا یہ ابتدائی دور تھا۔تمام اخبارات ہفت روزہ یا سہ روزہ ہوا کرتے تھے۔1857ء میں غدر کا واقعہ رونما ہوا۔انگریزوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ ہندو مسلم کے درمیان نااتفاقی پیدا کی جائے ،ہندی اور اردو کے مابین ٹکراؤ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی لیکن دونوں قوموں نے یکجہتی کا ثبوت دیتے ہوئے اردو زبان کو ہر خاص وعام کا وسیلۂ اظہار قرار دیا۔جس کے باعث اردو صحافت نے بتدریج ارتقائی مراحل کو طے کیا اور اردو اخبارات دن بدن ترقی کی جانب گامزن ہوئے۔اس میں بلا تفریق ملت و مذہب سب کی شمولیت تھی۔1857ء اور اس کے بعد جتنے بھی اخبارات نکلے ان میں زیادہ تر اردو ہی کا سہارا لیا گیا۔غدر کے بعد ہندوستانی اخباروں میں بالخصوص اردو کے اہم نام اردو گائڈ، اودھ اخبار، شمس الاخبار، طلسم حیرت، مدراس پنچ، امین الاخبار، وکٹوریہ گزٹ، ہندوستان ، اخبار عالم ،کانپور گزٹ، ریاض الاخبار، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مظہرالاخبار ،اردو اخبار ،آئینہ عالم، دھوم پرکاش ، اعلامیہ، تہذیب الاخلاق، گورنمنٹ گزٹ، سعدالاخبار، اودھ پنچ، شگوفہ، اتحاد، زمیندار، مخبر صادق، پیشوااور شمشیر قلم وغیرہ تھے جو انیسویں صدی کے صحافتی خدمات پر معمور تھے۔حیدرآباد دکن میں بھی اردو صحافت نے دور قدیم سے اپنی شناخت بنائے رکھی۔جنوبی ہند مدراس میں اردو صحافت کا آغاز 1841ء سے ہوتا ہے۔یہاں سے جاری ہونے والا پہلا اردو اخبار ''جامع الاخبار'' ہے۔یہ ہندوستان کے قدیم اخباروں میں شمار ہوتا ہے۔حیدرآباد دکن کا پہلا روزنامہ پیک آصفی تھا جو جنوری 1884ء میں جاری ہوا۔1888ء میں سفر دکن کے نام سے ایک اور اخبار جاری ہوا جس کے مدیر سید امجد علی اشہری تھے۔انیسویں صدی کا دکن کا اہم اخبار مشیر دکن تھا۔1887ء میں جاری ہوا۔

بیسویں صدی کی ہندوستانی صحافت نے بتدریج ارتقائی منازل کو طے کرتے ہوئے جنگ آزادی میں اہم رول ادا کیا۔اس دور کی صحافت کی خصوصیت یہ تھی کہ ملکی و غیر ملکی صحافت کے درمیان خطِ امتیاز قائم کیا اُس عہد کی ابتدائی اردو صحافت میں ''مخزن'' (1901)، ''زمانہ''(1903) اور ''زمیندار''(1903) کافی اہم ہیں۔ان اخبارات نے عوام میں اخبار بینی کا ذوق وشوق پیدا کیا۔حسرت موہانی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ''اردوئے معلّٰی'' (1903)کے ذریعے

www.urduacademyts.com

ہندوستان کی مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا اور اس کے ذریعے صحافت کی آبیاری کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''لسان الصدق'' کے ذریعے صحافت میں قدم رکھا، ''الہلال'' (1912) اور ''البلاغ'' (1927) کے ذریعے بیداری مغز کا کام کیا۔ مولانا ظفر علی خان نے ''ستارہ صبح'' اور ''زمیندار'' نکالا۔ محمد علی جوہر نے ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' (1912) عبدالمجید سالک نے ''انقلاب'' اور سید جالب دہلوی نے ''ہمدم'' نکالا۔ 1913ء میں میرٹھ سے ''توحید'' جاری ہوا۔ اسی سال حاجی ساجد احمد کی ادارت میں پٹنہ سے ''پٹنہ'' اخبار شائع ہوا۔ 1916ء میں مولانا عبدالمجید شرر آلندوری نے مدراس سے ماہنامہ رسالہ ''نور'' خواتین کے لئے شائع کیا۔ اکتوبر 1916ء میں لکھنؤ سے ہمدم جاری ہوا جو مسلم لیگ کا ترجمان تھا جس کے ایڈیٹر جالب دہلوی تھے۔ 1919 میں لاہور سے مہاشی کرشنن نے گاندھی جی کی پالیسیوں اور نیشنل کانگریس کی تائید میں ''پرتاب'' جاری کیا۔ اردوداں ہندوؤں میں اس کا اچھا اثر تھا مگر حکومت وقت کے جبر کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے اشاعت مسدود کرنی پڑی۔ 1920ء میں لاجپت راؤ نے لاہور سے ''وندے ماترم'' نکالا۔ یہ پہلا اخبار تھا جو کارپوریٹ سیکٹر کے تحت شائع ہوا تھا۔ پہلا ہی شمارہ 10 ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ یہ صحت مند صحافت کا نمونہ تھا۔ 1921ء میں شاہ امان اللہ نے بجنور سے ''نگینہ'' اور ''الامان'' اخبار نکالا۔ حکیم اجمل خان کی ایماء پر یہ اخبار دہلی منتقل ہوگیا۔ اسی سال لالہ شام لال کپور نے ''دسہری'' نکالا۔ اس سے پہلے وہ ''گروگھنٹال'' کے نام سے بھی اخبار نکال چکے تھے۔ 1922ء میں محمد عبداللطیف فاروقی نے مدراس سے روزانہ ''آزادِ ہند'' کی اشاعت کا آغاز کیا۔ 1923ء میں لالہ خوشحال چند خورشید نے ''ملاپ'' جاری کیا۔ اس سے پہلے وہ ''آریہ گزٹ'' نکالتے تھے۔ ''ملاپ'' دہلی، جالندھر، حیدرآباد اور لندن سے شائع ہوتا تھا' اب دہلی سے شائع ہورہا ہے۔ 1923ء میں سوامی شردھانند نے لالہ دیش بندھو گپتا کے ساتھ مل کر ''تیج'' نکالا جس کی راجستھان، یوپی اور دہلی میں اچھی اشاعت تھی۔ جاگیردار ریاستوں کی جانب سے بار بار اسے بند کیا گیا۔ 1924ء میں ریاست کشمیر کا پہلا اخبار ''رنبیر'' جاری ہوا جو مہاراجہ گلاب سنگھ کے بیٹے رنبیر سنگھ کے نام سے موسوم تھا۔ ایک سال بعد یہ بند ہوگیا۔ 1925ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اخبار ''سچ'' نکالا جو 1933ء تک جاری رہا۔ بعد میں اس کا نام ''صدق'' اور پھر ''صدق جدید'' کے نام سے جاری رہا۔ 1925ء میں ہفتہ وار ''الجمعیت'' جاری کیا۔ اس کی ادارت سے مولانا عرفان پھر ابوالاعلیٰ مودودی، بلال احمد زبیری، مولانا عبدالوحید صدیقی اور مولانا محمد عثمان فارقلیط وابستہ رہے۔ 1927ء میں لاہور سے انقلاب'' عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول بحر نے جاری کیا۔ یہ دستاویزی اخبار تھا جو 1949ء تک جاری رہا۔ 1927ء میں مولانا ابوالجلال ندوی، سید سلطان بہمنی اور نذیر احمد شاکر نے مدراس سے روزنامہ ''مسلمان'' جاری کیا جو اب بھی جاری ہے اور تاملناڈو کا واحد اردو اخبار ہے جس نے کتابت کے فن کو زندہ رکھا ہے اور آج بھی مکمل اخبار کی کتابت کی جاتی ہے۔ 1928ء میں دہلی سے مسلم لیگ کا ترجمان روزنامہ ''وحدت'' شائع ہوا۔ یہی وہ دور تھا جب علامہ اقبال کی شہرت بام عروج پر تھی۔ انہوں نے لاہور کے کچھ اخبارات کی سرپرستی بھی کی۔ 1929ء میں محمد عبداللطیف فاروقی اور عبدالکریم آزاد نے مدراس سے ''آزاد نوجوان'' کی اشاعت شروع کی۔ مولانا ابوالجلال ندوی نے 1933ء میں ماہنامہ ''بشریٰ''، محمد اسماعیل سیٹھ نے

www.urduacademyts.com

1934ء میں ہفتہ روزہ ''دلچسپ'' قاضی محمد عبدالرحمٰن نے ماہنامہ ''رفیق'' شائع کیا۔ مرتضیٰ احمد خان میکش اور چراغ حسن حسرت کی ادارت میں ''احسان'' 1934ء میں جاری ہوا جو اردو کا پہلا روزنامہ تھا جس کے دفتر میں ٹیلی پرنٹر نصب کیا گیا۔ اس دور کے اخبارات میں ''احرار، نیشنل کانگریس، زم زم، پاسبان، مساوات اور تریاق'' تھے۔ جبکہ لکھنؤ سے انیس احمد عباسی نے ''حقیقت'' جاری کیا جو روزنامہ سے ہفتہ وار میں تبدیل ہوا۔ قاضی عبدالغفار نے حیدرآباد سے پیام کی اجرائی کا آغاز کیا۔ 1931ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی سرپرستی میں ہفتہ وار ''پیغام'' نکالا۔ کچھ عرصہ بعد ''ہند'' جاری کیا۔ شبلی بی کام نے ہفتہ وار ''خیام'' جاری کیا۔ 1935ء میں علامہ شاکر نائطی نے عمرآباد تاملناڈو سے ماہنامہ ''مصحف'' محمد کریم الدین نے روزنامہ ''مسلم گزٹ'' مدراس، غلام محی الدین نے روزنامہ ''مسلم رپورٹ'' مدراس، ایمان گوپاموی، سید سلطان بہمنی نے 1936ء میں ماہنامہ ''رسالہ حیات'' مولانا ابوالجلال ندوی ''سہیل'' روزنامہ، سید سلطان بہمنی نے 1937ء میں ماہنامہ ''ہمدرد'' شائع کیا۔ 1938ء میں پٹنہ سے نذیر حیدر نے ''صدائے عام'' جاری کیا۔ سہیل عظیم آبادی نے روزنامہ ''ساتھی'' کی شروعات کی جسے غلام سرور نے لے لیا تھا۔ 1939ء میں ممبئی سے غلام احمد خان آرزو نے روزنامہ ''ہندوستان'' جاری کیا جو سرفراز آرزو کی ادارت میں اب بھی شائع ہورہا ہے۔ متحدہ ہندوستان کے مشہور اخبارات میں لاہور سے 1940ء میں ''شہباز'' کی اجرائی عمل میں آئی۔ اسی سال لاہور سے حمید نظامی نے ''نوائے وقت'' نکالا۔ چار سال بعد یہ روزنامہ ہوا۔ یہ پاکستان کا ملٹی ایڈیشن اخبار ہے۔ 1942ء میں دہلی سے میر خلیل الرحمٰن نے ''جنگ'' جاری کیا۔ 1947ء میں کراچی منتقل کیا۔ یہ پاکستان کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ کئی شہروں سے شائع ہوتا ہے۔ 1944ء میں جواہر لال نہرو نے 'قومی آواز' کی بنیاد ڈالی جس کے ایڈیٹر ڈاکٹر حیات اللہ انصاری تھے۔ یہ کانگریس کا ترجمان اور نیشنلسٹ اخبار تھا۔ مختلف شہروں سے اس کے ایڈیشن شائع ہونے لگے۔ افسوس کہ اس اخبار نے دم توڑ دیا۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف کے یہ وہ اخبارات ہیں جنہوں نے اردو صحافت کو عروج بخشا اور برٹش حکومت کے خلاف قومی جذبات اور انقلاب کے ولولوں سے ہندوستانی عوام کو بیدار کیا۔ اردو صحافت نے لوگوں میں آزادی کی روح کو بیدار کیا اور ملک کو آزادی دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

آزادی کے بعد تقسیم ملک کے ساتھ ساتھ اردو صحافت بھی تقسیم ہوگئی، جس سے اردو صحافت کا شیرازہ بکھر گیا، لیکن اس کے باوجود ہندوستانی اردو صحافت اپنے نئے جوش وجذبے اور سیکولر کے راستے دِیگر اخباروں کے ہم رَکاب ہونے میں کوئی کمی نہ کی۔ پرتاب، تیج، اور ملاپ نے سکہ جمایا، ہند سماچار نے اپنے وجود کو مستحکم کیا۔ قومی آواز نے اردو صحافت کو وقار بخشا، اس کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں سے نکلنے والے اخباروں میں حیدرآباد سے سیاست، رہنمائے دکن، منصف، اعتماد، پٹنہ سے صدائے عام اور ساتھی، لکھنو سے ہمدرد، بجنور سے نگینہ اور الامان، امرتسر سے وکیل، بمبئی سے انقلاب، اجمل، خلافت اور اردو ٹائمز، کلکتہ سے عصر جدید، اخبار مشرق، بنگلور سے سالار، کشمیر سے آذان، جمعیت علماء ہند سے الجمعیت، مسلم لیگ کا ترجمان وحدت، کانگریس کا ترجمان وطن اور بعد میں جواہر لال نہرو کی سرپرستی میں قومی آواز جاری ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی دور میں صحافت نے اپنا اصل مقام حاصل کیا۔ عمومی طور

www.urduacademyts.com

سے اس عہد کی صحافت نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے اثرات ثبت کئے ۔ اردو صحافت میں جو چیز قدر مشترک نظر آتی ہے وہ جنگ آزادی کی جد وجہد ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو صحافت نے ملک کو آزاد کرانے میں نمایاں حصہ لیا، عوامی بیداری اور سیاسی شعور کے بیدار کرنے میں اس نے جس قدر اپنا کردار ادا کیا وہ دوسرے تخلیقی عمل سے ناممکن تھا۔

عہد حاضر میں اردو صحافت کی خدمات قابل ستائش ہے اِس کی زندہ مثال یہ ہے کہ روزانہ معمول کے مطابق کروڑوں لوگوں کے ہاتھوں میں اردو کا کوئی نہ کوئی خبر نامہ ضرور ہوتا ہے۔ اردو روزناموں کی تعداد نئی رپورٹ 2010 -2011 کے مطابق 938 ہے۔ آج اردو صحافت مختلف زبانوں کے روزناموں کے مقابلے میں ہندی اور انگریزی کے بعد تیسرے نمبر پر ہے۔ اردو اخبارات کا مجموعی سرکولیشن دو کروڑ، سولہ لاکھ، انچالیس ہزار دوسو تیس کاپی ہے۔ اس طرح اردو صحافت روز بروز ترقی کے منازل طے کر رہی ہے۔ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ملک کے کئی بڑی ریاستوں اور شہروں سے اردو کے ممتاز اخبارات غیر معمولی انداز میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس دور کے سارے اخبارات انٹرنیٹ سے جڑے ہوئے ہیں ۔ جو ذرائع ابلاغ کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہندوستان کے مختلف جگہوں سے شائع ہونے والے اخباروں میں اہم نام جیسے دہلی سے راشٹریہ سہارا اردو، انقلاب، ہمارا سماج، پرتاب، صحافت، ہندوستان ایکسپریس، ان دنوں وغیرہ ہے۔ ممبئی سے انقلاب، اردو ٹائمز، سہارا اردو، حیدرآباد سے سیاست، منصف، رہنمائے دکن، اعتماد، صحافی دکن وغیرہ۔ لکھنو سے سہارا اردو، آگ۔ پٹنہ سے قومی تنظیم، سنگم، ہمارا سماج، سہارا اردو۔ بھوپال سے ندیم، بنگلور سے سالار، جالندھر سے ہند سماچار، اور ملاپ، کلکتہ سے اخبار مشرق، اور کشمیر سے آذان وغیرہ اخبارات نکلتے ہیں۔

انٹرنیٹ کے فروغ کے بعد مختلف ویب پورٹلس پر بھی اخبارات و رسائل صحافتی خدمات کے ساتھ فروغ اردو میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ اردو کے اہم قومی ویب پورٹلس میں نیوز 18۔ ساحل آن لائن۔ دی وائر اردو۔ بھٹکلیس ڈاٹ-کام۔ تعمیر نیوز۔ اسٹار نیوز ٹوڈے۔ ملت ٹائمز۔ فکر و خبر۔ معیشت۔ بصیرت آن لائن۔ قندیل۔ وائی دِس نیوز۔ ایشیا ٹائمز۔ اردو لیکس۔ سیدھی بات۔ الھلال میڈیا شامل ہیں۔ بین الاقوامی اردو نیوز پورٹلس میں بی بی سی اردو۔ وائس آف امریکہ۔ اردو ڈوچے ویلے جرمنی۔ العربیہ ڈاٹ نیٹ۔ اردو نیوز سعودی عرب۔ ترکی نیوز ویب سائٹ۔ اردو پوائنٹ وغیرہ شامل ہیں۔ جہاں آن لائن اردو خبریں بروقت پیش کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اہم موضوعات پر تجزیاتی مضامین بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں اس لیے عالمی سطح پر اردو قارئین تک ان کی پہونچ ہے۔ اردو صحافت کا سفر کاغذ سے لے کر انٹرنیٹ تک مختلف مراحل سے گزرتا رہا۔ آج مسابقت کے دور میں بھی اردو صحافت اپنی شناخت بنائے ہوئے ہے اور اسے مزید قاریوں کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

محمد تنویر
ریسرچ اسکالر
تلنگانہ یونیورسٹی
نظام آباد 503001 (تلنگانہ)

مضامین

www.urduacademyts.com

پروفیسر اشرف رفیع ایک ہمہ گیر شخصیت

محترمہ اشرف رفیع 4 راگست 1940ء کو حیدرآباد کے ایک معزز و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد مشہور معروف شاعر جناب محمد رفیع الدین صدیقی صاحب اردو اور فارسی کے استاد سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی ابتدائی تعلیم گرلز سٹی ہائی اسکول علیجاہ کوٹلہ میں ہوئی۔انٹرمیڈیٹ و گریجویشن ویمنس کالج سے کیا،اسکول کے زمانے سے ہی تحریری و تقریری مقابلوں اور بیت بازی کے مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق تھا۔اس کے علاوہ ڈراموں میں بھی کام کرتی تھیں۔گرایجویشن کے بعد ایک پرائیوٹ پرائمری اسکول میں صدر معلّمہ ہوگئیں۔عثمانیہ یونیورسٹی سے 1965ء میں ایم۔اے۔کیا۔اور 1970ء میں پی۔ایچ۔ڈی، پروفیسر مسعود حسین خان کی نگرانی میں مکمل کیا۔انکے مقالہ کا عنوان ''نظم طباطبائی شخصیت اور فن کا تنقیدی جائزہ'' تھا۔اس کے بعد ونیتا مہاودیالیہ میں بحیثیت اردو لکچرار اور ریڈر مقرر ہوئیں۔ 1989ء میں صدر شعبۂ اردو کی ذمہ داری سنبھالی۔1992ء میں بورڈ آف اسٹڈیز کی چیرمین منتخب ہوئیں۔ان ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی، ثقافتی، تہذیبی، صحافتی اور سماجی ذمہ داریوں کو بحسن خوبی انجام دیتی رہیں۔

خوش مزاج، باصلاحیت، شائستہ طرز گفتگو نے ان کو یونیورسٹی کی ایک ہر دلعزیز شخصیت بنادیا۔مزاج میں سادگی کے ساتھ ساتھ پروقار شخصیت کی حامل ہونے کی وجہ سے ہر کوئی آپ سے ملنے کا متمنی رہتا تھا۔طلباء چاہے کتنا ہی حدو ادب کو ملحوظ رکھیں،لیکن آپ اتنی ہی ملنساری، اپنائیت سے، ہم کلام ہوتی ہیں۔سیدھی سادی سی ذہین خاتون جو علم و ادب سے شغف رکھتی ہیں۔اعلیٰ خاندان کی تربیت نے انھیں خوب نکھارا، سنوارا ہے۔ان کی آمد سے محفل میں جان پڑ جاتی ہے۔جب وہ یونیورسٹی میں تھیں تو کئی سیمنار ہوئے۔لیکن تین کل ہند سیمنار کا انعقاد بڑی مستعدی اور ذمہ داری کے ساتھ اپنی نگرانی میں منعقد کیا۔1997ء میں بحیثیت صدر شعبۂ اردو ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ان کی خدمات کے اعتراف میں قدیم طلباء یونیورسٹی نے وداعی تقریب Farewell بہت شاندار انداز میں مدینہ سنٹر نامپلی، حیدرآباد میں منعقد کیا جس میں عثمانیہ یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر جناب رام کشٹیا صاحب نے بذات خود شرکت کی اور تقریباً تین گھنٹوں تک پروگرام کے آخر تک شریک رہے۔

محترمہ اشرف رفیع صاحبہ حیدرآباد کی مایۂ ناز ادیبہ، محقق، نقاد اور شاعرہ ہیں۔جنکی قومی سطح پر ایک الگ پہچان ہے جو دکنیات اور لسانی تحقیق میں بلند مقام رکھتی ہیں۔ان تمام خصوصیات کے باوجود ایک اور خصوصیت ان میں ہے۔وہ یہ کہ محترمہ بہترین پامسٹ (علم نجوم) کو جاننے والی ہیں۔ان کی شخصیت کا یہ پہلو ہر کوئی نہیں جانتا۔صرف خاص لوگوں کے علم میں یہ بات ہے کہ وہ خوابوں کی تعبیر، ہاتھوں کی لکیروں،

www.urduacademyts.com

نام اور تاریخ پیدائش کے ذریعہ اپنے علم کے مطابق لوگوں کا مستقبل بتایا کرتی تھیں۔انھوں نے باضابطہ علم نجوم کو سیکھا ہے۔ پامسٹری کی کتابیں پڑھی ہیں۔کالج میں پڑھانے کے زمانے سے ہی شوقیہ وہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں اور ساتھیوں کے ہاتھ دیکھ کر، نام، تاریخ پیدائش کے ذریعہ ان کا مستقبل بتایا کرتی تھیں جو تقریباً سچ ہی ہوا کرتا تھا۔آہستہ آہستہ وہ کالج میں مشہور ہوگئیں۔خواتین، طالبات اور لڑکیاں اپنے آنے والے کل یعنی مستقبل کو جاننے کے لئے آپ سے ملاقات کی متمنی رہتی تھیں اور اپنے ہاتھوں کی ہتیلیوں کو محترمہ کے سامنے پھیلا کر اپنا مستقبل جاننے کے کوشش کرتی تھیں یا اپنے خواب بیان کر کے خوابوں کی تعبیر جاننا چاہتی تھیں۔اس طرح ان کی کئی پیشنگوئی صحیح ثابت ہوتی تھی لیکن اپنے سفر حج کے بعد سے انھوں نے اس علم کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کردیا۔

اشرف رفیع صاحبہ نے نا صرف، نثر بلکہ نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی تخلیقات نثر میں (۱) نظم طباطبائی کی شخصیت اور فن (۲) مقالات طبا طبائی (۳) تلخیص عروض قوافی (۴) تلاش زبان وادب (۵) بھوت (۶) سوئی کی تلاش (۷) بی اماں کے ساتھ ساتھ اور نظم کے مجموعہ کلام۔ (۱) عود غزل (۲) پھر سے جینا ہوگا (۳) دکنی مثنوایات کا انتخاب شامل ہے۔محترمہ کی غزلیں، نعتیں، مضامین ادبی محفلوں، مشاعروں اور دوردرشن چینل پر پڑھی، سنی اور دیکھی جاتی ہیں۔ وہ مشاعروں اور ادبی محفلوں کی صدرات کے علاوہ کئی ادبی و علمی اداروں سے بھی وابستہ ہیں۔جیسے ادارہ ادبیات اردو، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیوٹ کی صدر، انجمن ترقی اردو حیدرآباد، نظامس اردو ٹرسٹ اردو لائبریری، انجمن محفل خواتین وغیرہ۔ محترمہ کی ادبی خدمات پر اردو اکیڈمی (اے۔پی)، اردو اکیڈمی (یو۔پی)، امتیاز میر ایوارڈ اور کارنامہ حیات ایوارڈ، ڈاکٹر محی الدین قادری ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔محترمہ کا مقصد حیات علم و ادب کی راہوں کو روشن کرنا ہے۔آپ کی محنت اور کاوشوں سے علم وادب کی دنیا میں سینکڑوں اہل قلم پیدا ہوئے۔انھوں نے اردو دنیا کو چراغاں کیا۔

شاعری:

ڈاکٹر اشرف رفیع صاحبہ کی شاعری میں نسائی حسیت، نسوانی لب ولہجہ، نسوانی خیالات، نسوانی جذبات و احساسات کو جدید انداز میں پیش کیا ہے۔ان کا پہلا مجموعہ کلام ''عود غزل'' ہے جس میں غزلیں شامل ہیں۔یہ غزلیں، کلاسکی دور کی یاد دلاتی ہیں۔ان کی غزلوں میں غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کا بھی اظہار ملتا ہے۔عود غزل کی شاعری سے محترمہ کے ایک حساس، پختہ شعور، فکر آگہی سے لبریز کلاسکی شاعرہ نظر آتی ہے۔ان کی غزلوں میں غضب کی غنائیت اور نغمگی ملتی ہے۔وہ بیک وقت اپنے محبوب سے وفا کا اظہار بھی کرتی ہے اور دنیا کی بے ثباتی کا گِلہ کرتی نظر آتی ہیں:

خموشی چھا گئی ارباب محفل سر جھکائے بیٹھے
یہ کیوں بیٹھے بٹھائے ہم تری محفل میں آ بیٹھے

وفا کی سخت راہوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا
کسی کی رہنمائی کو ہم اپنا دل جلا بیٹھے

www.urduacademyts.com

سمجھتے کاش تم کھوٹے کھرے کا فرق دنیا میں
عدو کو دوست سمجھے ،دوست کو دشمن بنا بیٹھے
وہی ہم ہیں ،وہی دنیا ،وہی دنیا کی رنگینی
مگر احبا ب ، ا قدارِ محبت ہی بھلا بیٹھے
(عودغزل،ص:۱۳۷)

نہیں شعور نظر کسی میں
ہزاروں غم ہیں مری ہنسی میں
نہیں ہے معیار کوئی باقی
نہ دشمنی میں نہ دوستی میں
نہ چھیڑ ان کو اے جذبِ دل
وہ رو پڑیں گے ہنسی ہنسی میں
(عودغزل۔ص:۱۳۴)

محترمہ کے پہلے شعری مجموعہ میں کلاسکی اور روایتی شاعری نظر آتی ہے۔جبکہ دوسرا مجموعہ ''پھر سے جینا ہوگا'' میں وہ ایک مکمل جدید نسائی لب ولہجہ کی شاعرہ نظر آتی ہے۔ دوسرے مجموعہ کلام میں نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔غزلیں، قطعات اور ثلاثی موجود ہے۔محترمہ نے اپنی شاعری میں دور حاضر کے عصری موضوعات ،مذہنی موضوعات ،عشقیہ موضوعات وغیرہ کو بہترین پیکر میں ڈھالا ہے۔ان کی نظموں میں عصری پختہ شعور،عصر حاضر کے تمام تقاضوں سے مکمل وقفیت رکھتی ہیں۔موجودہ دور کے گھریلو حالات،کسم پرسی، مہنگائی،خاص کر گھریلوں خواتین کی الجھنیں،کم آمدنی وغیرہ جیسے مسائل کو پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ عورتوں کی صلاحیتوں کی ناقدری اور خود اپنی صحت وخوبصورتی پر عدم توجہی وغیرہ کو بھی بہترین انداز میں پیش کیا۔

(الجھن):

بچوں کے اسکول کی فیس
بجلی اور پانی کا بل
ٹی وی اور قالین کی قسطیں
بنئے کا اُدھار
بس میں دفتر
اور رستے پر
بکھرے ہیں نظروں کے تار
کن کن چیزوں میں الجھا ہے
میرا چین سنگھار
(الجھن، پھر سے جینا ہوگا۔ص:۱۰۹)

محترمہ کی شاعری میں محبوب کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔عورت کے جذبات کی یکسانیت،اپنے لاکھ ترقی یا فتہ ہونے کے باوجود محبوب کی جدائی یا محبوب کی شراکت داری برداشت نہیں کرسکتی۔عورت چاہے دنیا کا اعلیٰ یا بلند ترین عہدہ بھی کیوں نہ حاصل کرلیں۔اپنے محبوب کے ساتھ دوسری کو برداشت نہیں کرسکتی۔یہ ایک نسائی جذبہ محبت ہے۔جس کو محترمہ نے نظم کی شکل میں پیش کیا ہے۔

(لمس) :

پہلی پہلی بار تو نے
تو نے

www.urduacademyts.com

جب تھاما تھا میرا ہاتھ
مرے بدن میں دوڑ گئی تھی
عجب لہر سی
عجیب لذت
عجیب خوشبو
عجب نشہ
جھکی تھی نظریں
تھے ہونٹ لرزاں
میں لمحہ لمحہ پگھل رہی تھی

محبوب کا خط بھی شاعروں کا موضع رہا ہے۔ محترمہ کہتی ہیں:

خط کا آنا نیند کا جانا
اُس نے لکھا ایسا کیا کچھ
ذرا سا خط انھیں لکھنا ہے مشکل
بہت سے لکھ دیئے ہونگے مقالہ

اپنی تہذیب اور زبان سے نئی نسل کا دور ہونا محترمہ کو بہت کھٹکتا ہے۔ کہتی ہیں کہ:

جو لٹائیں زکواۃ علم و ہنر
ایسے اب صاحب نصاب کہاں
نہیں ہے ہم زباں بچوں میں کوئی
کتب خانہ کروں کس کے حوالے

محترمہ کے چند اشعار اپنے اندر گہرے معنیٰ رکھتے ہیں:

عطائے جام میں کیوں تجھ کو عزر ہے ساقی
یہ دل نہیں ہے جو بار دگر نہیں ملتا
دھندلی سی کس قدر ہے یہ محفل کی روشنی
شاید کوئی جلائے ہوئے شمع جل گیا
ڈوب کر ہم خیال ماضی میں
کتنی یادوں کو آج رو بیٹھے
اشرفؔ یہ نمک پاشی کا انداز حسیں ہے
تم پرسش احوال کو درماں نہ سمجھنا

اور بعض اشعار سے اپنے پر اعتماد ہونے کا بھی ثبوت دیا ہے:

تجھ کو دے دوں میں گھڑی بھر کے لئے اپنا دل
تیرا دل ،دل نہ رہے شعلہ رقصاں ہو جائے !
اشرفؔ بغور دیکھ ذرا چہرہ غزل
درد نہاں کا رنگ ہے حسن سروش ہے !
مستی دیدۂ فطرت ہے جو شامل اس میں
کبھی خم ہے کبھی مینا ہے کبھی جام غزل

اس کے علاوہ انکے اشعار میں اپنے رہنماؤں پر گہرا طنز بھی نظر آتا ہے:

کسی دن بیچ ڈالیں گے ہمالہ
یہ میرے رہنما رہبر جیالے
میکدوں کا یہ حال ہے ساقی
جام خالی ہیں بہہ رہی ہے شراب
آج وہ کہتے ہیں کچھ کل وہ کہیں گے کچھ اور
انکی نیرنگی گفتار سے جی ڈرتا ہے
ڈر رہے ہیں لوگ اشرفؔ ہو رہے ہیں مشورے
کہیں خرگوش کچھوے کا وہی قصّہ نہ ہو جائے

www.urduacademyts.com

تمہارے شہر میں دیکھے ہیں ایسے گوشے بھی
جہاں سے ہو کے بھی زندگی نہیں گذری

رشتہ داروں اور دوستوں کا حال یوں بھی بیان کرتی ہیں۔ان کی شاعری میں تلمیح کے اشعار بھی ہیں۔

منائی تھی جنہوں نے لعنت دار و رسن پہلے
انہی کو یار لوگوں نے صلیبوں پر چڑھایا تھا

گھر ہمارا ہی ہم سجا نہ سکے
عمر بھر یوں تو آرزو کی ہے

محترمہ نے اپنی نظموں میں نسائی حسیت کا کھل کر اظہار کیا ہے۔عورت جو ایک ماں کا تقدس چاہتی ہے۔ اگر نہ مل سکے تو کان ماں کے لفظ سننے کے لئے ترس جاتے ہیں۔اس شعر میں محرومی کا گلا کیا ہے۔

میرے آگن میں چاند تارے
یہ مانگا تھا مگر تو نے دیا کیا

اس ترقی یافتہ دور میں بھی خواتین وہی روایتی مجبوریوں کے سبب اپنی مظلومیت کا اظہار یوں کرتی ہے کہ

پکاتے، سیتے اکثر سوچتی ہوں
پڑھانا آج ہے کالج میں کیا کیا

آج کل عورتیں دوہری زندگی جی رہی ہیں۔گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ باہر کی ذمہ داری یعنی نوکری وغیرہ کے ذریعہ اپنے معاشی پستی کو سنوارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہر دن ایک نیا چیالنج ہوتا ہے۔اور خاص کر ایسی خواتین جو نوکری کرتی ہیں ان کو دونوں ذمہ داریاں بحسن خوبی انجام دینے ہوتے ہیں۔شاعرہ اپنے بچپن کی شرارتوں اور بچپن کے چلبلے پن کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

یہ بچوں کی ہے بوڑھی نسل اشرفؔ
اسے لوٹا سکوگی بچپنا کیا

اور آخر میں اپنے سیاسی رہنماؤں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں:

نمائشی کراہ سے ہمیں کوئی غرض نہیں
بہانہ ساز آہ سے ہمیں کوئی غرض نہیں
بیاض زندگی میں امن کا ورق بھی صاف
یہ عافیت کا قصر ہے اور قصر میں شگاف ہے
زمین پہ آسماں نہیں یہ ظلم کا غلاف ہے
ہمیں یہ ظلم سے اٹی ہوئی فضاء سے اختلاف ہے

اشرف رفیع صاحبہ نے ہندی کے الفاظ کو بھی اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔کہتی ہیں:

اس عہد ترقی میں میرے شہر میں لوگو
آشاؤں کے چندن ہیں سلگتی ہیں قبائیں
آس نراس کے سب دھوکے ہیں
کیسی دوری کیسا درشن

یوں تو شاعرہ نے اپنے کلام میں بہت سے موضوعات کو باندھا ہے۔مضمون کی طوالت سے احتراز کرتے ہوئے مضمون کو اختتام پذیر کرتا ہوں۔

☆☆☆

www.urduacademyts.com

پروفیسر محمد انورالدین بہ حیثیت تحقیق نگار

ڈاکٹر راہی فدائی ''دکنی ادب کی تحقیق وتنقید اور محمد علی اثر'' مضمون میں لکھتے ہیں:

''کسی بھی زبان کی ترقی وترویج میں اس کے دور اولین پانچ صدیاں بے کار و بے معنی نہیں ہوتیں، خصوصاً اردو جیسی نوخیز وکم عمر زبان کے لیے تو یہ پانچ سو بہاریں نہایت وقیع اور بے حد یادگار ہونے کے علاوہ سرمایہ افتخار بھی ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر قدیم اردو ادب کی اس زبوں حالی خصوصاً دکنیات سے بے توجہی و بے اعتنائی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے۔ ان سنگین حالات کے تدارک میں مصروف کار رہنے اور اپنے زور قلم سے ان احوال کا مقابلہ کرنے کے لیے کمر بستہ رہنے والے معدودے چند مستشرقین اور ماہرین دکنیات میں چارلس اسٹیوارٹ، اشپرنگر، گارساں دتاسی، بلوم ہارٹ، حکیم شمس الحق قادری، مولوی عبدالحق، نصیرالدین ہاشمی، محمود شیرانی، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، افسر صدیقی، سخاوت مرزا، جمیل جالبی، شمس الرحمٰن فاروقی، سیدہ جعفر، گیان چند، معین الدین عقیل اور محمد علی اثر قابلِ ذکر ہیں۔ چناں چہ ان تمام محققین نے اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق اپنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر قدیم اردو (دکنی ادب) کی جس طرح خدمت انجام دی وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ ان محققین نے ایسی تاریک راہوں میں شمع علم جلایا ہے جہاں دور دور تک روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی تھی۔

(معجم دکنیات۔اول۔ پروفیسر محمد علی اثر۔ص: 10 اور 11)

تحقیق میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی۔ تاہم تحقیق میں جو لُطف اور محنت ہے وہ شاید ہی کسی اور میدان میں ہو۔ ڈاکٹر محمد انورالدین نے بھی اسی دشت کی سیاحی کی ہے۔ جن کی کاوشوں کو دادِ تحقیق دیتے ہوئے گیان چند نے لکھا ہے:

''حیدرآباد کا پہلا رسالہ ایک طبی بلکہ ڈاکٹری پرچہ رسالہ طبابت تھا۔ بستان آصفیہ جلد دوم میں مانک راؤ وٹھل راؤ نے اس کا سنہ اجرا ۱۲۷۷ھ لکھا ہے۔ شمس اللہ قادری نے ۱۲۷۵ھ دیا ہے۔ یہی تاریخ نصیرالدین ہاشمی، تمکین کاظمی اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے دہرادی۔ معاصر لکھنے والوں میں طیب انصاری اور ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے بھی حیدرآباد کے پہلے رسالے کو ۱۲۷۵ھ سے منسوب کیا لیکن انورالدین نے پہلا شمارا تلاش کر کے حتمی طور پر طے کیا کہ یہ رسالہ ۱۲۷۲ھ میں جاری ہوا۔ اتفاق سے یہ حیدرآباد ہی کا نہیں پورے ملک کا پہلا طبی رسالہ تھا'' (بحوالہ ''حیدرآباد دکن کے علمی وادبی رسائل، تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔ص۔3)

پروفیسر محمد انورالدین کی تحقیق کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے لکھا ہے:

''اقبال کی تحسین کے مسئلہ پر ڈاکٹر انورالدین نے نہایت معروضی انداز میں اقبال کے ناقدین کی تحریروں کا جائزہ لیا ہے۔ اقبال کے اُسلوب پر بھی ان کی تحریر اہمیت

www.urduacademyts.com

رکھتی ہے لیکن اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' پر ان کی تحقیق اپنا جواب آپ ہے۔ یہ مضمون اقبالیات میں اپنی جگہ رکھے گا۔ فراق کے عشق اور فانی کے شعری سفر کے بارے میں ان کا مطالعہ غور وفکر کا حامل ہے۔ خصوصاً فانی کی یاسیت کا تجزیہ اعتبار رکھتا ہے۔ اکبر کے مکاتیب پر ہمارے ہاں کم ہی لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد انورالدین نے اس موضوع کا خوبی کے ساتھ محاسبہ کیا ہے کہ اکبر الہ آبادی کی شخصیت کے کئی پہلو اظہر من الشمس ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک اچھا مضمون ہے ۔ جدیدیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد انورالدین جدیدیت کو ترقی پسندی کا ردِعمل قرار دیتے ہیں۔ یہ مضمون مختصر لیکن جامع ہے۔ اردو ناول میں حقیقت نگاری کے رجحانات پر بھی انہوں نے اچھی بحث کی ہے۔ دکنیات پر ان کے تینوں مضامین میں ''ابن نشاطی اور پھول بن'' معرکہ آراء ہے۔ دکنیات پر ہمارے ہاں تحقیق خاصی کی گئی ہے اور تنقید کم۔ ڈاکٹر انورالدین نے یہاں تنقیدی زاویہ سے زیادہ کام لیا ہے اور خوبی کے ساتھ۔ استاد محترم پروفیسر سروری صاحب کی شخصیت اور تصانیف پر ڈاکٹر محمد انور الدین نے غیر معمولی محنت سے قلم اٹھایا ہے کہ سروری صاحب کی دلنواز شخصیت کچھ اور دلنواز ہوجاتی ہے۔ صحافت پر ڈاکٹر محمد انورالدین کے پانچ مضامین ہیں۔ یہ تحقیقی نوعیت کے بھی ہیں اور تنقیدی نوعیت کے بھی اسی کے ساتھ معلومات آفریں بھی ۔ ڈاکٹر محمد انورالدین کے شستہ اندازِ تحریر نے ان مضامین کو خوشگوار اور دلچسپ بنادیا ہے'' (بحوالہ روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد، صفحہ۔4، 30/جون 1997ء)۔

پروفیسر محمد انورالدین نے اپنے تحقیقی مقالے ''ڈاکٹر زور کی مرتبہ تواریخ ادب وتذکرے'' میں ڈاکٹر زور کو دکنی تحقیق کے میر قافلہ اور اردو میں لسانیات کے ابوالآباء بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''انھوں (ڈاکٹر زور) نے ادب کے مختلف شعبوں کو اپنے فکر ونظر کی جولان گاہ بنایا۔ تنقید، تحقیق، لسانیات، صوتیات، افسانہ نگاری، ادبی تاریخ، سوانح نگاری، مکتوب نگاری، شاعری غرض یہ کہ ادب کا کونسا پہلو تھا جسے ان کے کلک گہربار نے اپنی تراوش سے نہیں سنوارا۔ موضوعات کے تنوع اور رنگارنگی کے اعتبار سے اردو کا شاید ہی کوئی اہل قلم ان کی برابری کا دعویٰ کرسکتا ہے'' (بحوالہ ''اذکار واخبار'' ص۔44)

موصوف نے ڈاکٹر زور کی چار کتابیں (1) اردو شہہ پارے (2) تاریخ ادب اردو (3) دکنی ادب کی تاریخ (4) داستانِ ادبِ حیدرآباد کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر زور کی تحقیق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو شہہ پارے کے بارے میں بتایا ہے کہ جس وقت ڈاکٹر زور اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تکمیل اور اردو زبان کے لسانی اور صوتیاتی مسائل پر تحقیقی کام کے سلسلہ میں لندن اور پیرس میں مقیم تھے اس وقت آکسفورڈ، کیمبرج، پیرس اور اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانوں میں قدیم اردو کی نایاب قلمی کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا۔ ان میں بعض وہ تھے جن کے نسخے ہندوستان میں نہیں تھے۔ اس ادبی ذخیرے کے بیشتر حصوں کا انتخاب جمع

www.urduacademyts.com

کیا۔ حیدرآباد آنے کے بعد ان انتخابات میں مزید کا اضافہ کیا جن میں ''نواب عنایت جنگ بہادر اور پروفیسر آغا حیدر حسن کے گراں قدر کتب خانوں میں مخزونہ بعض نادر و نایاب مخطوطات کے انتخابات شامل ہیں ۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں کے قلمی نسخوں میں انھیں عبداللہ قطب شاہ، غواصی اور ابن نشاطی کی تصاویر دستیاب ہوئیں۔ محکمہ آثار قدیمہ (سابقہ ریاست حیدرآباد کے گنجینۂ نوادرات) سے انھوں نے علی عادل شاہ دوم، سید شاہ راجو ، ابوالحسن تاناشاہ اور محمد قلی قطب شاہ کی تصاویر کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کی چند اردو غزلوں کے خوش خط قطعات جو انھیں کے دور میں انھیں کے لیے بطور وصلی لکھے گئے تھے کے فوٹوز حاصل کئے اور ان سب کو اس کتاب میں شامل کیا'' (بحوالہ: اذکار و اخبار، ص۔45)

پروفیسر محمد انورالدین ، ڈاکٹر زور کی کتاب ''اردو شہہ پارے'' کے حوالے سے یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس کتاب نے ولی اورنگ آبادی سے ماقبل کی تاریخ کو روشنی میں لانے کا کام کیا ہے۔ کتاب میں ادبیت کو ترجیح دی گئی ہے اور تاریخ وار مرتب کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کے ارتقاء کو دکھانے کی سعی کی گئی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ 1929ء میں شائع یہ کتاب دکنی ادب کی تحقیق میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ آگے کے صفحات میں لکھا ہے کہ:

''اس میں کوئی دورائیں نہیں ہوسکتیں کہ اردو شہہ پارے کی اشاعت نے اردو زبان کی ادبی تاریخ کو طوالت بخشنے اور اردو کی قدامت اور بزرگی قائم کرنے میں بڑا حصہ لیا'' اس بات کا بھی اظہار محمد انورالدین نے کیا ہے کہ ایسے کام خالی از اسقام نہیں ہوتے۔ اس کا احساس ڈاکٹر زور کو تھا۔ جس کا اظہار کتاب کے مقدمہ میں ڈاکٹر زور نے کیا ہے جس کا حوالہ دینے کے بعد ڈاکٹر محمد انورالدین لکھتے ہیں:

''اسے زور صاحب کی بصیرت کہیے یا پیش بینی کا کمال کہ ان کا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ چناں چہ مابعد دور میں دکنیات کے میدان میں جو نئی نئی تحقیقات ہوئیں، ان کی روشنی میں اردو شہہ پارے کے بعض مندرجات اور بیانات تصحیح طلب قرار پائے''۔ (بحوالہ: اذکار و اخبار۔ص۔48)

پروفیسر محمد انورالدین نے اس کے بعد ڈاکٹر زور کی دوسری کتاب ''تاریخ ادب اردو'' کے مشمولات کا جائزہ لیا ہے اور اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ یہ کتاب مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو ہے لیکن دراصل یہ ڈاکٹر زور ہی کے قلم کا نتیجہ ہے۔ جس کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر انورالدین لکھتے ہیں:

''ماہنامہ سب رس 1963ء یادگار زور نمبر میں ڈاکٹر زور کے مقالہ نما کے مرتب وقار خلیل نے اس کتاب کو ڈاکٹر زور کی تصانیف میں شامل کیا ہے۔ (ص:390)'' اس کے بعد اس کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے کوئی خاص بات کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے ۔ البتہ کتاب کے چوتھے حصہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس حصے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر زور نے دکن کے بعض اہم شاعروں اور نثر نگاروں کو تاریخ

www.urduacademyts.com

ادب اردو کی پوری روایت کے پس منظر میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ دکن کے اہلِ قلم میں گردھاری پرشاد باقی ، ڈاکٹر احمد حسین مائل، جلال الدین توفیق ، رضی الدین حسن کیفی اور طیبہ بیگم کا ذکر شامل ہے''

(بحوالہ:اذکار واخبار۔ص۔50)

آخر میں ڈاکٹر محمد انورالدین نے جو بات لکھی ہے وہ ان کے تحقیقی مزاج کے عین مطابق ہے۔وہ مذکورہ کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔یہ کتاب ڈاکٹر زور کے مطابق تحقیقی وسائنٹفک بنیاد پر مرتب کی گئی ہے لیکن ظاہر ہے کہ گذشتہ نصف صدی کے دوران تحقیق وتنقید نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کی روشنی میں اس کتاب کی کئی باتیں ساقط الاعتبار قرار پائی ہیں لیکن اختصار وجامعیت کے پہلو سے یہ کتاب بہرحال اپنی قدر وقیمت رکھتی ہے''۔

(ایضاً۔ص۔50)

وہ کئی باتیں جو ساقط الاعتبار قرار پاتی ہیں اس کا تذکرہ ڈاکٹر انورالدین نے نہیں کیا ہے۔اگر تذکرہ کر دیتے تو مناسب ہوتا اور تحقیق کرنے والے افراد اور ریسرچ اسکالر کو آسانی ہوتی ۔مبصر جب کسی کتاب پر تبصرہ کرتا ہے تو اس کو یہ سب زیب دیتا ہے لیکن مضمون نگار کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اہم چیزوں کو تذکرہ کرے۔یعنی کوئی اہم چیز مضمون میں جگہ پانے سے نہ رہ جائے۔

ڈاکٹر زور کی تیسری کتاب ''دکنی ادب کی تاریخ'' کے بارے میں پروفیسر انورالدین نے لکھا ہے کہ:

''دکنی ادب کی تواریخ میں زور صاحب کی یہ تصنیف اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1960ء میں منظر عام پر آئی۔اور تب سے آج تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔کمال تو یہ ہے کہ زائد از ربع صدی کا عرصہ گزرنے کے باوجود اس کی اہمیت اور افادیت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی'' (بحوالہ: اذکار واخبار۔ص۔50)۔

یہ کتاب 1350ء سے 1750ء پورے چار سو سال کی تاریخ اپنے اندر رکھتی ہے۔ چھ ابواب پر مشتمل یہ کتاب دکن کے قدیم ادبی مراکز بیدر، گلبرگہ، بیجاپور اور گولکنڈہ کے ادبی قلمکاروں کی زندگی ، ان کا فن اور ان کی شخصیت کے بارے میں بیش بہا معلومات رکھتی ہے۔ پہلے باب میں ''عہد بہمنی'' کے عنوان کے تحت جن شعراء کے حالات اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے ان میں شیخ عین الدین گنج العلم ، سید محمد حسینی حضرت خواجہ بندہ نوازؒ، فخر دین نظامی، مشتاق، لطفی، فیروز بیدری، اشرف، شاہ میراں جی شمس العشاق اور سید شہباز حسینی شامل ہیں۔ پروفیسر محمد انورالدین لکھتے ہیں کہ شیخ عین الدین گنج العلم سے منسوب دکنی تصنیفات معروف الاسم اور معدوم الوجود ہیں۔ اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ سے منسوب معراج العاشقین ڈاکٹر حفیظ قتیل مرحوم کی تحقیق کے مطابق مخدوم شاہ حسینی بلکانوری کی تصنیف ثابت ہوچکی ہے۔

دوسرا باب ''عادل شاہی عہد'' کے عنوان سے

www.urduacademyts.com

1076ھ م 1665ء میں مکمل ہوئی۔ قطعہ تاریخ یہ ہے:

صفادار اس کی دیکھ ہر ایک چمن میں
دکھیا ہوں ناؤں اس کا پھول بن میں
اٹھا تاریخ لایا تو یہ گلزار
گیارہ سو کوں کو کم تھے بیس پر چار

گیارہ سو میں سے بیس پر چار یعنی چوبیس کم کرنے سے 1076ھ برآمد ہوتے ہیں۔ چوں کہ بعض نسخوں میں آخری مصرع کے بیس کو تیس پڑھا جاسکتا تھا۔ اس سے التباس ہو رہا تھا لیکن اب گورنمنٹ اورینٹل مینوا سکرپٹ لائبریری حیدرآباد اور انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان کے نسخوں سے التباس باقی نہیں رہا۔ اور 1076ھ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، شیخ چاند، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بھی یہی سال صحیح مانا ہے۔ اس لیے پھول بن کی سنہ تصنیف 1076ھ م 1665ء قرار پاتا ہے۔ (بحوالہ: ماہنامہ شاداب حیدرآباد، جولائی 1988ء، جلد 5، شمارہ 4، ص۔ 32-33)

انورالدین نے نہ صرف خود تحقیق کی ہے بلکہ جہاں کہیں ایسی کوئی کتاب جو تحقیق سے متعلق ہو منظر عام پر آجائے تو انھوں نے اس پر مضمون لکھ کر اس کتاب کو بھی قارئین تک پہنچا کر قارئین کے تحقیقی ذوق کی تسکین کا سامان بھی کیا ہے۔ ایسا ہی ایک تبصرہ ماہنامہ ''آندھرا پردیش'' میں ''تحقیقات۔ دکنی تحقیق میں ایک وقیع اضافہ'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نئی پود میں دکنی اور دکنیات سے لگاؤ اور شغف باقی نہیں رہا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک طرح کا متوحشانہ رویہ اور گریز کا رجحان عام ہے۔ اس طرح یہ میدان ایک عرصہ دراز سے کسی تازہ وارد سیاح کی دشت پیمائی کا منتظر تھا۔ دکن کے اس سونے میکدے کے مئے مردافگن تحقیق کے حریص ہونے کا اعزاز حیدرآباد کے ایک جواں سال محقق محمد نسیم الدین فریس کے حصہ میں آیا جس کی تصنیف ''تحقیقات'' کے عنوان سے 1993ء کے اواخر منصۂ شہود پر آئی۔ چکی ناموں کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ میں مصنف نے پورے اعتماد کے ساتھ سابقہ محققین جیسے ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر زور اور نصیرالدین ہاشمی کے تسامحات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مصنف نے قدیم مخطوطات کے ذخائر سے بعض نئے چکی نامے اور بعض نامعلوم چکی ناموں کے نئے متون دریافت کئے ہیں۔ (ص۔ 14-13) نسیم الدین فریس نے نہایت تحقیق و جستجو سے دکنی کی قدیم مخطوطات کا مطالعہ کر کے بعض ایسی اصناف دریافت کی ہیں جو اب تک نامعلوم تھیں۔ اس مضمون میں دکنی کی تین متروک اصناف چارکرسی، برہنی، کھاڑا کا تعارف کرایا ہے۔ فاضل مصنف نے ان میں سے ہر صنف کی نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ اس کے فن اور مواد کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ (ص۔ 15)۔ ''تحقیقات'' کا اگلا مضمون ایک نایاب چرخہ نامہ ہے اس میں فاضل مصنف نے دکن کے ایک قدیم چرخہ نامہ کا تعارف کرایا ہے۔ یہ چرخہ نامہ انھیں ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی ایک قدیم بیاض سے

مضامین

www.urduacademyts.com

دستیاب ہوا۔ چرخہ ناموں کے سلسلہ میں عام طور پر محققین صرف ایک ہی چرخہ نامہ کا حوالہ دیتے ہیں جس کے نسخے کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان کی زینت ہیں۔نسیم الدین کا دریافت کردہ چرخہ نامہ اس سلسلے کی دوسری مثال ہے۔ یہ چرخہ نامہ سیدی برہان کا مصنفہ ہے جسے اس مضمون میں تنقیدی نوٹ اور تدوین متن کے ساتھ پیش کر کے مصنف نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا ہے (ص:15,16)۔مجموعی اعتبار سے تحقیقات، دکنیات کے میدان میں ایک گراں مایہ اضافہ ہے جس کے ذریعہ دکنی کے بعض قدیم شعراء، اور قدیم شہ پارے اور قدیم اصناف کو پہلی مرتبہ دنیائے علم وتحقیق سے آشنا کرایا گیا ہے۔

(ماہنامہ آندھراپردیش حیدرآباد، اکٹوبر 1995ء، ص:16)

مجموعی طور پر پروفیسر محمد انورالدین کی تحقیق کا انداز طالب علمانہ بھی ہے اور محققانہ بھی ہے۔ جہاں کہیں سے کوئی اہم بات اور تحقیق کا پتہ چلا ہے انھوں نے اس کو یکجا کر کے دنیائے علم وادب تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔گوان کی تحقیق کو سند کا درجہ تو نہیں دیا گیا ہے لیکن وہ ایک معتبر اور قابلِ ذکر محقق ضرور ہیں۔ اوران کی تحقیق اور رائے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆

فاطمہ اختر

ایم۔اے، یو پی ٹی

ریسرچ اسکالر (پی ایچ ڈی، اُردو) عثمانیہ یونیورسٹی

خاموشی کیا ہے اور ضرورت پر بولنا کیسا ہے

خاموشی کیا ہے؟ خاموشی ایک زبان ہے جسے ہر کوئی اپنے ڈھنگ سے بولتا ہے ۔خاموشی بولتی ہی نہیں چیختی بھی ہے۔۔۔پکارتی اور لتاڑتی بھی ہے۔۔۔

محبوبہ خاموش رہے تو ناراضی۔۔۔محبوب خاموش رہے تو بزدلی۔

والدین خاموش رہیں تو مجبوری۔۔۔اولاد خاموش رہے تو سعادت مندی۔۔۔

انسان خاموش رہے تو بے بسی۔۔۔انسانیت خاموش رہے تو بے حسی۔۔۔

قوم خاموش رہے تو مظلومیت۔۔۔اور حکمران خاموش رہے تو سیاست۔۔۔

یہ خاموشی سکہ رائج الوقت ہے۔ جب بھی رائج ہوجاتی ہے تو کسی کو خرید لیتی ہے یا کسی کو بیچ دیتی ہے ۔ لیکن۔۔۔یہ ہمیشہ رائج نہیں رہتی۔خاص موقع اور خاص وقت پر استعمال کی جاتی ہے۔اسی لئے کم بولنے اور زیادہ سننے والوں کو عقلمند کہا جاتا ہے۔۔۔

آپ نے اس سے کیا اثر لیا ہے۔اگر آپ دانشمند اور عقل مند بننا چاہتے ہیں تو کم بولنے اور زیادہ سننے والے بنیں، ہاں بعض موقعوں پر خاموشی صحیح نہیں ہوتی جیسے کہ کسی ناحق پر مسلسل ظلم ہورہا ہو اور آپ دیکھتے بھالتے خاموشی اختیار کرلیں۔ایسے میں بولنا اور سنانا زیادہ اہم ہوگا۔ہاں اگر کسی بات پر جاہلوں سے بحث تکرار کی نوبت آئے تو اس وقت قرآن کریم سورۃ الفرقان کی آیۃ نمبر 63 کے احکام کے مطابق عمل کریں ۔جس کا ترجمہ ہے ''اور رحمٰن کے وہ بندے کہ زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں بس سلام۔۔۔''اسی میں ہماری بہتری ہے۔

ماخوذ

www.urduacademyts.com

اکیسویں صدی میں اسلوبیاتی تنقید

جدید تنقیدی رجحانات میں ایک اہم رجحان اسلوبیاتی تنقید کا ہے۔ اردو ادب میں اسلوبیاتی تنقید نے گزشتہ چند دہائیوں میں ارتقاء کی منزلوں سے گزر کر ایک دبستان کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ اردو ادب میں اسلوبیاتی تنقید کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ کیونکہ اردو میں اسلوبیاتی تنقید کو متعارف کرانے کا سہرا ڈاکٹر مسعود حسین خان کے سر ہے۔ ہمارے یہاں اسلوبیات کی بحث اس وقت سے شروع ہوئی جب مسعود حسین خان نے اسلوبیات پر باقاعدہ مضمون بعنوان ''مطالعۂ شعر: صوتیاتی نقطہ نظر سے'' ۱۹۶۰ء میں لکھا جو انکے مجموعۂ مضامین 'شعر و زبان (۱۹۶۶) میں شامل ہے۔ مسعود حسین خان ہی پہلے نقاد ہیں جنہوں نے اسلوبیات کے مبادیات پر غور کیا اور اردو ناقدین کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ یہ امر غور طلب ہے کہ ۱۹۶۰ سے لے کر ۲۰۲۱ تک کی قلیل مدت میں آل احمد سرور، پروفیسر گوپی چند نارنگ، مغنی تبسم، مرزا خلیل احمد بیگ، طارق سعید، علی رفاد فتیحی، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور قاضی عبید الرحمٰن وغیرہ جیسے نقادوں نے مضامین اور کتب لکھی ہیں۔ ان سطور میں میرا مقصد اسلوبیات کے تمام تر مباحث اور کتب کا تجزیہ پیش کرنا نہیں ہے بلکہ میں نے حتیٰ الامکان کوشش کی ہے کہ یہاں صرف ان ہی نقادوں کا ذکر کیا جائے جن کی کتابیں اکیسویں صدی یعنی سنہ ۲۰۰۰ء کے بعد منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اردو کے اسلوبیاتی ناقدین میں مغنی تبسم، مرزا خلیل احمد بیگ، طارق سعید اور علی رفاد فتیحی ایسے نقاد ہیں جن کا تعارف بیسویں صدی میں ہی ہو چکا تھا تاہم ان ناقدین نے اکیسویں صدی میں بھی اسلوبیات پر کام کیا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور قاضی عبید الرحمٰن کا شمار خالص اکیسویں صدی کے اسلوبیاتی نقادوں میں کیا جاتا ہے۔

اسلوبیاتی تنقید پر بحث کرنے سے قبل یہ جان لینا ضروری ہے کہ اسلوب کیا ہے؟ ''اسلوب'' دراصل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی طرز یا ادا کے ہیں۔ انگریزی میں اسلوب کے لئے Style اور اطالوی زبان میں Stylos جیسے الفاظ مستعمل ہیں۔ ادبی تنقید میں اسلوب کا مطلب طرزِ نگارش کے ہیں۔ کیونکہ اسلوب ہی کے ذریعہ ہم کسی تخلیق کار یا نقاد کی شناخت کرتے ہیں۔ مغربی ادب میں اسلوبیات پر بہت کچھ کام ہوا ہے اور ان کے یہاں اسلوب کا ایک واضح مطمح نظر دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ مڈلٹن مرے جو اسلوبیات کے ماہرین میں سے ایک ہے' اس کا کہنا ہے کہ اسلوب سے مراد اظہار کی وہ ذاتی انفرادیت ہے جس کی بنا پر ہم کسی مصنف کو پہچان لیتے ہیں۔ مرے ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

"Style naturally comes to be applied to writer's idiosyncrasy because style is the direct

www.urduacademyts.com

expression of an individual mode of experience"

[The problem of style by- J. Middleton Murray, Pg - 8, Humphrey Milford Oxford University Press 1992]

اسلوبیاتی مطالعۂ ادب طرزِ عمل کی حیثیت سے بہت وسعت رکھتا ہے۔ یہ طرزِ عمل دشوار گزار ہے اس کو سمجھنے کے لئے ذوقِ نظر کی ضرورت ہے چناچہ گوپی چند نارنگ کے ان جملوں کو پیش کرنا بجا معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب ''ادبی تنقید اور اسلوبیات'' کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ:

''اتنی بات واضح رہے کہ اسلوبیات سے ادبی مطالعے میں کام لینے کے لئے ذوقِ نظر شرط ہے۔ ذوقِ نظر جتنا بالیدہ اور رویت آگاہ ہوگا اسلوبیاتی مطالعہ اتنا ہی روشن اور معلومات افزا ہوگا''۔۔۔(دیباچہ ادبی تنقید اور سلوبیات، ص۲) گوپی چند نارنگ

اسلوبیات کی مشکل پسندی کی وجہ سے اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہمارے ناقدین نے ادبی جسارت سے کام لیا اور اس میدان میں آگے بڑھے۔ اسلوب کا براہ راست تعلق اطلاقی لسانیات Applied Linguistics سے ہے۔ یہ ایک معروضی طرزِ نقد ہے جس کی بنیاد سائنسی اصولوں پر رکھی جاتی ہے۔ یہاں شاعر کے ذاتی حالات سے زیادہ اسکی تخلیق اور اس کے ادب پارے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہاں تاثرات اور جمالیات کا بس نہیں چلتا۔ اسلوبیاتی نقادوں کے نزدیک صوتی، نحوی، صرفی، لغوی اور معنیاتی پہلوؤں کو زیرِ بحث لاکر کسی تخلیق کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

ماہرین اسلوبیات نے اسلوبیاتی مطالعے کی سہولت کے لئے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا لسانی اسلوبیات (Linguistic Stylistic) اور دوسرا ادبی اسلوبیات (Literary Stylistic) ہے۔ لسانی اسلوبیات کے تحت لفظوں کی بناوٹ، ان کی ساخت، آوازوں کا تاثر، اسم، فعل، ضمائر اور فقرے وغیرہ کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ جبکہ ادبی اسلوبیات کے ذیل میں علم بدائع، تشبیہ، استعارہ، علامت، تجنیس، تمثیل کو شامل کیا جاتا ہے۔

پروفیسر مغنی تبسم اکیسویں صدی کے اہم نقادوں میں سے ایک ہیں۔ بحیثیت اسلوبیات نقاد اردو تنقید کے افق پر ان کی نمود اس وقت ہوئی جب انہوں نے فانی بدایونی پر اپنا تحقیقی مقالہ ۱۹۶۹ء میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد اسلوبیاتی تنقید پر ان کی ایک اہم کتاب بعنوان'' آدمی اور آواز'' ۱۹۸۳ء میں منظرِ عام پر آئی۔ مغنی تبسم کے تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ'' زبان و ادب'' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل تیرہ (۱۳) مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر مغنی تبسم نے زبان

www.urduacademyts.com

کے صوتیاتی مطالعہ (Phonological Aspect of Language) کو ترجیح دی ہے ۔اس ضمن میں ان کے مضامین ''اصوات اور شاعری''، ''اردو عروض کا مطالعہ صوتیاتی نقطہ نظر سے''، ''غالب کی شاعری..... بازیچۂ اصوات'' بطورِ مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مغنی تبسم کے نزدیک بعض اوقات شعر کا صوتیاتی مطالعہ نظری مطالعے سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے مضمون ''اصوات اور شاعری'' میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''شعر کے نظری مطالعے سے بعض ایسی خوبیاں (بالخصوص اس کا آہنگ اور نغمگی) نظر انداز ہوجاتی ہیں جن کو بلند آواز سے پڑھ کر یا سن کر ہی محسوس کیا جاسکتا ہے اور لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ اسی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آج کل یورپ اور امریکہ کے مدارس میں شعر خوانی کے صحیح طریقے پر زور دیا جارہا ہے اور سلسلہ میں اس علم صوتیات سے مدد لی جارہی ہے''۔۔۔ مغنی تبسم (مضمون'' اصوات اور شاعری'' مشمولہ 'زبان وادب'، ص:۹)

مغنی تبسم کے مذکورہ جملے اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ مطالعہ شعر کے لئے علم اصوات کا ہونا کسی قدر ضروری ہے۔ ایک قریب کی مثال یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ فیضؔ کی نظم 'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے' کا آہنگ نظری مطالعہ سے زیادہ صوتیاتی مطالعہ میں پرکشش نظر آتا ہے۔

جیسا کہ اوپر گزرا کہ اسلوب کا مطلب طرز یا نگارش کے ہیں ۔ اسی طرح اردو میں لفظ ''لہجہ'' بھی تقریباً انہیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور لہجے کا تعلق راست یا براہ راست طور پر طرز یا طرزِ ادا سے ہوتا ہے۔ اسلوبیاتی تنقید میں لہجے کو خاص دخل ہے کیونکہ لہجہ ہی آگے چل کر اسلوب کی شکل اختیار کرتا ہے۔ مغنی تبسم نے اپنے مضمون ''میر کا لہجہ'' میں شعر اور طرزِ ادا کے حوالے سے بڑی معنی خیز باتیں کہی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''لہجے کا شعر کی قرأت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ نظم یا شعر کا صوتی آہنگ مصوتوں اور مصمتوں کی تنظیم اور ادائیگی سے تشکیل پاتا ہے۔ لہجے کا تعلق زیادہ تر طرزِ ادائیگی سے ہے جس کو نظم یا شعر کی بنیادی احساس اور تجربے سے ہم آہنگ ہونا چاہئے''۔ (مغنی تبسم: مضمون ''میر کا لہجہ'' مشمولہ 'زبان وادب' ص: ۷۸)

اس کے علاوہ کتاب 'زبان و ادب' میں شامل مضامین ''غالب کا آہنگِ شعر اور بحروں کا ستعمال''، ''کلامِ غالب میں اسالیب کی آویزش'' بھی عمدہ مضامین ہیں جن کے مطالعے سے اسلوبیاتی زاویۂ نگاہ کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔

اسلوبیاتی تنقید پر گفتگو مرزا خلیل احمد بیگ کے ذکر کے بغیر ادھوری سمجھی جائے گی کیونکہ جس انہماک اور سنجیدگی سے مرزا خلیل بیگ نے اسلوبیات پر متواتر کام کیا ہے وہ واقعی قابلِ ستائش ہے۔ مرزا خلیل بیگ نے نہ صرف اسلوبیات کی نظری بنیادوں کا احاطہ کیا ہے بلکہ اسلوبیات کی عملی تنقید بھی پیش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوبیاتی ناقدین میں وہ بلند

www.urduacademyts.com

مرتبہ رکھتے ہیں ۔ بحیثیت نقاد مرزا خلیل بیگ کا تعارف ۱۹۸۳ء کے آس پاس ہوا جب انہوں نے ''زبان، اسلوب اور اسلوبیات'' نامی کتاب لکھی ۔ اس کے بعد'' اردو کی لسانی تشکیل'' (۱۹۸۵)، ''نذرِ مسعود'' (۱۹۸۹) وغیرہ کتابیں شائع ہوئیں۔

اسلوبیاتی تنقید پر اکیسویں صدی میں مرزا خلیل بیگ کی تین کتابیں '' تنقید اور اسلوبیاتی تنقید'' (۲۰۰۵)، '' مسعود حسین خان : احوال و آثار'' (۲۰۱۵)، ''اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے'' (۲۰۱۴) میں منظرِ عام پر آئیں ۔ تاہم '' لسانی مسائل و مباحث'' کو مزید ترمیم و اضافے کے ساتھ ۲۰۱۶ء میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔

'' تنقید اور اسلوبیاتی تنقید'' ۱۵ مضامین کا مجموعہ ہے جسے چار ذیلی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے عنوانات منجملہ یہ ہیں کہ ' اسلوبیاتی تنقید نظری مباحث' 'اسلوبیاتی نظریہ ساز'، 'اسلوبیاتی تجزیے'، ' اور نئے تنقیدی زاویے' ۔ متذکرہ کتاب کے مطالعہ سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ مرزا خلیل بیگ نے مغرب اور مشرق کے ناقدین کی روشنی میں اسلوبیاتی تنقید کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب اسلوبیات کی گہرائی کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ آیئے ذرا دیکھتے ہیں کہ وہ اسلوبیات کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں ۔ وہ اپنے مضمون اسلوبیاتی تنقید میں لکھتے ہیں کہ:

'' اسلوبیاتی تنقید میں ادبی زبان کا تجزیہ یا ادب میں زبان کے استعمال کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے اور فن پارے کے 'اسلوبی خصائص' (Style-features) کا تعین کیا جاتا ہے جن کا ایک فن پارے کو دوسرے فن پارے سے ممتاز بنانے میں اہم رول ہوتا ہے۔ اسلوبی خصائص کی بنیاد پر ہم ایک ادیب یا شاعر کو دوسرے ادیب یا شاعر سے بھی ممتاز بنا سکتے ہیں۔ اسلوبیاتی تنقید کی بنیاد فن پارے کے لسانیاتی تجزیے پر قائم ہے۔ لسانیاتی تجزیے کے بغیر کسی فن پارے کی اسلوبیاتی خصوصیات کا تعین ممکن نہیں''۔۔۔ (مضمون ''اسلوبیاتی تنقید'' مشمولہ تنقید اور اسلوبیاتی تنقید، ص: ۲۰)

مرزا خلیل احمد بیگ:

درجِ بالا سطور کے مطالعے سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ مرزا خلیل بیگ اسلوبیات کے لئے لسانیات کو ضروری گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلوبیات اور لسانیات میں گہرا ربط ہے۔ جس کا اعادہ انہوں نے مذکورہ کتاب کے دوسرے مضمون '' اسلوبیاتی تنقید : چند بنیادی باتیں'' میں واضح طور پر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اسلوبیاتی تنقید سے متعلق سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا لسانیات سے بہت گہرا رشتہ ہے، کیونکہ زبان جو لسانیات کا مواد و موضوع ہے، وہی زبان ادب کا ذریعۂ اظہار بھی ہے ۔ اور ادبی زبان کا مطالعہ و تجزیہ ہی 'اسلوبیات' (Stylistics) کہلاتا ہے''۔۔۔ ۔ مرزا خلیل احمد بیگ (مضمون '' اسلوبیاتی تنقید : چند بنیادی باتیں'' مشمولہ تنقید اور اسلوبیاتی تنقید، ص: ۳۰)

مرزا خلیل بیگ کی ان باتوں کی روشنی میں دو امور

www.urduacademyts.com

سامنے آتے ہیں اول یہ کہ زبان جو لسانیات کو مواد فراہم کرتی ہے اور دوسرا امر یہ ہے کہ زبان ہی ادب کے اظہار کا وسیلہ بنتی ہے۔ کیونکہ ادب کا تصور اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک اس کا موثر اظہار نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر کوئی ادیب ہوتا۔ کیونکہ ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ تخیلات تو ہوتے ہی ہیں پس اس میں سے جو لوگ تخلیق کار کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اپنی خلاقی سے ان تخیلات و تصورات کو تخلیق کی شکل دیتے ہیں اور یہ تخلیق اس وقت مکمل ہوتی ہے جب صفحہ قرطاس پر آجاتی ہے۔

اسلوبیاتی تنقید پر مرزا خلیل بیگ کی سب سے اہم کتاب ''اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے'' ہے جو ۲۰۱۴ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اسلوبیات کے موضوع پر اسے اردو ادب کی بہترین تنقیدی کتب میں سے ایک ہے۔ ۴۸۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کل ۳۱ مضامین کو چھ ذیلی عنوانات یعنی 'ادبی تنقید اور لسانیات و اسلوبیات'، 'نظریۂ اسلوب اور اسلوبیاتی تنقید'، 'اسلوبیاتی نظریہ ساز'، 'نثری اسلوبیاتی تجزیے'، 'شعری اسلوبیاتی تجزیے'، 'ادبی اسلوبیات' کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور اس میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو انکی کتاب 'تنقید اور اسلوبیاتی تنقید' میں بھی شامل ہیں۔ جیسے اسلوبیاتی تنقید، اسلوبیاتی نظریۂ تنقید: چند بنیادی باتیں، ابوالکلام کی نثر، بیدی کی زبان وغیرہ۔

کتاب کا پہلا حصہ 'ادبی تنقید اور لسانیات و اسلوبیات' کے عنوان سے ہے جس میں بیگ صاحب نے کل چار مضامین شامل کئے ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے ادبی تنقید اور لسانیات کے رشتہ کی وضاحت کی ہے۔ نیز ادبی تنقید کے لسانی مضمرات کو واضح کیا ہے۔ اور اسلوب کے مفہوم کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دوسرا حصہ جو 'نظریۂ اسلوب اور اسلوبیاتی تنقید' کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔ اس حصے میں کل پانچ مضامین شامل ہیں جن کے مطالعے سے نقدِ زبان اور اسلوب کے مسائل کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

'اسلوبیاتی نظریہ ساز' اس کتاب کا تیسرا حصہ ہے جس میں مرزا خلیل بیگ نے مغرب کے نقادوں مثلاً سیمور چٹمن، رینے ولک، رچرڈ ڈاے، سیموئل آر اور ہیلیڈے وغیرہ کے حوالے سے اسلوبیاتی تنقید کے مختلف نظریات کو پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس حصہ میں اردو کے اسلوبیاتی نقاد مثلاً مسعود حسین خان، گوپی چند نارنگ اور مغنی تبسم کی تنقیدات کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ''اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے'' میں عملی تنقید کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مذکورہ کتاب کے مضامین جیسے 'ابوالکلام کی نثر'، 'رشید احمد صدیقی کا طنزیہ و مزاحیہ اسلوب'، 'بیدی کی زبان'، 'شعری اسلوب کا صوتیاتی مطالعہ'، 'فیض کی نظم تنہائی ایک اسلوبیاتی مطالعہ'، 'اختر انصاری کی طویل نظم 'وقت کی بانہوں میں : ایک اسلوبیاتی مطالعہ'

مضامین

www.urduacademyts.com

وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن کے مطالعے سے شعری اور نثری اسلوب کا فرق واضح ہوتا ہے اور اسلوبیاتی تنقید کی معنویت اور اہمیت کو وسعت ملتی ہے۔ مرزا خلیل بیگ نے اسلوبیات کے تحت عملی تنقید کے اصول بھی بتائے ہیں۔ چنانچہ مضمون 'شعری اسلوب کا صوتیاتی مطالعہ' میں وہ رقمطراز ہیں کہ:

''اس قسم کے تجزیے میں سب سے پہلے زیرِ تجزیہ نظم کو صوتی تحریر یعنی transcription Phonetic میں منتقل کیا جاتا ہے نظم کی مصمتوں (Consunants) اور مصوتوں (Vowels) کی جدا گانہ فہرستیں تیار کی جاتی ہیں۔ پھر ان آوازوں کا جتنی بار استعمال زیرِ تجزیہ نظم میں ہوا ہے ان کی تعداد بھی درج کی جاتی ہے۔ پھر کثیر الاستعمال آوازوں کا مقابلہ اس نظم کے الفاظ سے کیا جاتا ہے اور اس امر کا تعین کیا جاتا ہے کہ کس لفظ کا صوتی ڈھانچا ان آوازوں یا ان میں سے بیشتر آوازوں سے مل کر تیار ہوا ہے۔ پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ معنیاتی نقطۂ نظر سے یہ لفظ یا فقرہ نظم کے مجموعی تاثر، بنیادی خیال اور مفہوم کو ظاہر کرتا ہے یا نہیں، پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ نظم میں یہ لفظ کس جگہ مندرج ہوا ہے، نیز اس سے نظم کے تاثر پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر یہ لفظ نظم کی غالب آوازوں سے مل کر بنا ہے اور معنی کو بھی مجتمع یعنی Sum up کرتا ہے تو اسے تجمعی لفظ (Summative word) کہیں گے''

(مرزا خلیل احمد بیگ: مضمون ''شعری اسلوب کا صوتیاتی مطالعہ'' مشمولہ 'اسلوبیاتی تنقید : نظری بنیادیں اور تجزیہ' صفحہ: ۳۵۶)

اسلوبیاتی تنقید پر بحث کرتے وقت پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ذکر ناگزیر ہے۔ نارنگ صاحب نے اسلوبیاتی تنقید پر ''ادبی تنقید اور اسلوبیات''، ''اسلوبیاتِ میر'' اور ''پاٹھک وادی آلوچنا'' لکھی ہیں جو اکیسویں صدی سے قبل ہی منظرِ عام پر آ چکی ہیں جب کہ ''ساختیات اور پس ساختیات'' پہلی دفعہ ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۲۰۰۴ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

''ساختیات اور پس ساختیات'' میں انہوں نے زبان اور لسانیات سے متعلق مختلف نکات کو اجاگر کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ادبی تھیوری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مشرقی شعریات کی اساس کا ادراک ہوتا ہے۔ یہاں اس نقطے کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلوبیاتی تنقید اور ساختیاتی تنقید دو الگ الگ دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی اساس لسانیات ہے۔ اس لئے اس مضمون میں قصداً مذکورہ کتاب کے سرسری جائزہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کتاب پر علیحدہ طور پر ایک مضمون کی ضرورت ہے۔

اکیسویں صدی کے معتبر اسلوبیاتی نقادوں میں ایک نام علی رفاد فتیحی کا بھی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید پر ان کی پہلی کتاب ''اسلوبیاتی تنقید'' کے نام سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی حالیہ کتاب ''ساخت اور اسلوب: نظریہ و تجزیہ'' ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب آٹھ مضامین پر مشتمل ہے جس کے چھ مضامین میں انہوں نے ادب کے ساختیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جب کہ دو مضامین بعنوان ''اسلوبیاتی

www.urduacademyts.com

تنقید'' اور'' اسلوب'' ایسے ہیں جو خالص اسلوبیاتی نقد و بصر کا نمونہ ہیں۔ اس کتاب کے حرفِ آغاز میں فتحی صاحب نے اس کی نوعیت اور موقف کو مختصراً ظاہر کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'' یہ کتاب 'ساخت و اسلوب: نظریہ و تجزیہ' اردو تنقید کا نیا طریقہ کار، ایک نئی میتھو ڈولوجی پیش کرتی ہے اپنے طرزِ مطالعہ اور طریقہ کار کی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک خالص تجزیاتی تنقید ہے جس کا سروکار پوری طرح فن و ہیئت کے مسائیل و معاملات سے ہے۔ ساخت و اسلوب: نظریہ و تجزیہ کا بنیادی مقصد زبان و ادب کے آپسی رشتے کو اجاگر کرنا اور ان مباحث سے دامن بچانا ہے جن سے ادب کا براہِ راست رشتہ قائم نہیں ہوسکتا۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ساخت اور اسلوب: نظریہ و تجزیہ صحیح معنوں میں تنقید کا ایک ذمہ دارانہ اور معروضی عمل ہے''۔۔۔ (علی رفاد فتحی: حرفِ آغاز، 'ساخت اور اسلوب' صفحہ ۸)

درجِ بالا سطور میں علی رفاد فتحی نے دو دعوے پیش کیے ہیں پہلا یہ کہ ان کی یہ کتاب ''نئی میتھو ڈولوجی پیش کرتی ہے''۔ دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ ''یہ ایک خالص تجزیاتی مطالعہ ہے'' دوسرا دعویٰ زیادہ قابلِ قبول ہے۔ اب اگر آپ مرزا خلیل بیگ اور علی رفاد فتحی صاحبان کے اسلوبیاتی نقد و بصر پر توجہ ڈالیں تو یہ واضح ہوگا کہ مرزا خلیل بیگ نے اسلوبیات پر جو کام کیا ہے وہ زیادہ خالص اور نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ہاں یہ مماثلت دیکھنے کو ضرور ملے گی کہ مرزا خلیل بیگ اور علی رفاد فتحی دونوں ہی ناقدین نے اپنی تنقیدات میں ادب اور زبان کے رشتے کو اہمیت دی ہے۔

اسلوبیاتی تنقید کے حوالے سے قاضی عبید الرحمن ہاشمی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان کی کتاب ''تنقید و تفہیم'' کے نام سے ۲۰۱۲ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں کل ۳۵ مضامین شامل ہیں جن میں '' رشید احمد صدیقی کا طریقۂ نقد'' اور ''اسلوب کی ماہیئت اور عمل تشکیل'' خاصے اہم ہیں جن کے مطالعے سے اسلوبیات کے طریقہ نقد اور اسکی ہیئت پر روشنی پڑتی ہے۔ ''اسلوب کی ماہیئت اور عمل تشکیل'' کے مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ قاضی صاحب نے اسلوبیات میں مضمر دو خاص پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اول طریقۂ اظہار اور دوم بہتر طریقۂ اظہار۔ حالانکہ انہوں نے اس امر کی وضاحت نہیں کی ہے۔ میرے خیال میں ہر تخلیق کار یا تنقید نگار کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ادب پارے کو پیش کرنے کے لئے بہتر سے بہتر طریقۂ اظہار کا استعمال کرتا ہے۔ یہاں طریقۂ اظہار اور بہتر طریقۂ اظہار کی کوئی تفریق نہیں رہتی۔ قاضی صاحب نے مختلف مغربی نقاد جیسے مڈلٹن مرے، ہربرٹ ریڈ اور یوفون جبن وغیرہ کی کتب سے استفادہ کیا ہے اور ان ہی کے خیالات کے ذریعہ سے اسلوبیات کی گرہ کشائی کی ہے۔ بہتر اسلوب ادیب کو انفرادیت بخشتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ادیب کی ذمہ داری یہ ہے کہ عصری میلانات کو اپنے ادب پاروں میں جگہ دے۔

اکیسویں صدی میں سانس لینے والے نقادوں کی فہرست میں ایک نام ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کا بھی ہے۔

www.urduacademyts.com

اسلوبیاتی نقد و نگاہ کے لحاظ سے ان کی کتاب ''رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ'' جس کی اشاعت ۲۰۱۴ء میں ہوئی تھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں خواجہ اکرام صاحب نے اسلوب کی بہت عمدہ تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اسلوبیاتی مطالعہ ایک سائنسی طرزِ عمل اور معروضی مطالعہ ہے جس میں طرزِ تحریر سے متعلق مسائل و مباحث ، زبان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں ، صاحبِ اسلوب کے انتخاب و انحراف ، اسلوب کے تشکیلی عناصر کے مدِ نظر صوتی، صرفی اور نحوی سطح پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ان میں کسی ایک سطح کو بنیاد بنا کر بھی تجزیاتی مطالعہ ممکن ہے''۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین: پیشِ لفظ ''رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ'' صفحہ ۱۰)

خواجہ اکرام صاحب نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے رشید احمد صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں خواجہ اکرام صاحب نے ایک طرف رشید احمد صدیقی کے تمام تخلیقات کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا ہے وہیں دوسری طرف رشید احمد صدیقی کے مجموعۂ مضامین ''مضامینِ رشید'' کی روشنی میں انکے منفرد اسلوب کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں خواجہ اکرام صاحب نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے اسلوب کو سامنے رکھ کر رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا فرق واضح کیا ہے اور اس تقابلی جائزے میں انہوں نے رشید احمد صدیقی کے اسلوب کو فرحت اللہ بیگ کے اسلوب سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسلوبیاتی تنقید پر اس مختصر تجزیے میں اکیسویں صدی کے اسلوبیاتی نقادوں کے حوالے سے اسلوب اور اسلوبیات کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے، زبان اور ادب کے درمیانی ربط کی وضاحت ، اسلوبیاتی تنقید اور لسانیات کے رشتے کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ اس مضمون کے ذریعہ اسلوبیاتی نظریہ ساز اور عملی ناقدین کا تعارف ان کی کتب کے حوالے سے کرانے کی کوشش کی گئی۔ اسلوبیات ایک وسیع موضوع ہے جسے چند صفحات میں قلمبند کرنا ممکن نہیں۔ اگر اس مضمون میں شامل کردہ نکات کی شرح کی جائے تو یہ کتابی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

ارشاد احمد
ریسرچ اسکالر، عالیہ یونیورسیٹی
ایکشن ایریا۔II، پلاٹ نمبر IIA/27،

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف، خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں ۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروار ہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی، اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔

ادارہ قومی زبان

www.urduacademyts.com

دکنی تحقیق میں اسلم مرزا کے اِضافے

سرزمین دکن کا شہر اورنگ آباد صدیوں سے علم و اَدب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ روایت وؔلی، سراؔج، مولوی عبدالحق، سکندر علی وجد کے علاوہ عہدِ حاضر تک کئی اُدیبوں اور شاعروں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور کاوشوں سے اُردو دنیا میں ایک مستند اور معتبر مقام حاصل کیا۔ اِن غیر معمولی شخصیتوں میں اسلم مرزا بھی ہیں جو ایک نامور اَدیب، شاعر، مورخ، مشہورِ زمانہ مترجم اور محقق کی حیثیت سے اَدبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔

اسلم مرزا کے کئی تحقیقی و تنقیدی مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ گو کہ اُنھوں نے اپنے اَدبی سفر کا آغاز افسانے، مضامین اور شاعری سے کیا۔ لیکن دکنی ادب، دکنی تاریخ اور ترجمہ کے علاوہ تحقیق سے دلچسپی کی بناء پر اُن کی کئی تحقیقی کتابیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اِس موضوع کی مناسبت سے دکنی تحقیقی تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے، اسلم مرزا کی دکنی تحقیق میں گراں قدر خدمات کا مطالعہ پیش ہے۔

اسلم مرزا کی پہلی نثری تحقیقی و تنقیدی کتاب ''آئینہ معنی نما ہے'' 2003ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کا نام وؔلی اورنگ آبادی کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

سجن کے حُسن کوں ٹک فکر سوں دیکھ
کہ یہ آئینہ معنی نما ہے

اسلم مرزا کی یہ کتاب آغا مرزا بیگ کی وؔلی اورنگ آبادی کی جلد اوّل اور جلد دوّم میں شامل غلط بیانات کی رد میں بارہ مضامین کو پورے دلائل اور حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں بشر نواز لکھتے ہیں:

''اگر ہم آغا مرزا بیگ کی کتاب سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ کیسی نثر نہیں لکھنی چاہیے اور کیسی تحقیق کی جانی چاہیے تو اسلم مرزا کے تازہ مضامین سے جان سکتے ہیں کہ تحقیق کتنی ذمہ داری، جاں کا ہی اور پتہ ماری کا کام ہے اور ایک محقق کو مختلف علوم سے کس حد تک واقفیت رکھنی چاہیے۔''
(حوالہ: بشر نواز، دیباچہ مشمولہ ''آئینہ معنی نما'' از اسلم مرزا۔2003ء، ص:4)

اسلم مرزا کی دوسری تصنیف ''عطرِ گُلِ مہتاب'' ہے جو 2008ء میں منظرِ عام پر آئی، اِس میں عزلؔت سورتی کی شعری تخلیقات کو پیش کیا گیا ہے، جس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:

1۔ شہر درد آباد کا شاعر عزلؔت
2۔ دیوانِ عزلؔت اُردو کا نسخۂ احمد نگر
3۔ عزلؔت کی مرثیہ نگاری
4۔ سراؔج اور عزلؔت کا تقابلی مطالعہ
5۔ کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

www.urduacademyts.com

6۔نرگن

7۔دیوانِ عزلتؔ فارسی کے آٹھ ورق

8۔عزلتؔ تذکرہ نگاروں کی نظر میں

اِن تمام مضامین میں حقائق کی بازیافت ہوتی ہے۔عزلتؔ سورتی کا شمار اُن شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے ولیؔ اورنگ آبادی کے بعد دکن اور شمالی ہند میں اُردو شاعری کو نئے لب ولہجہ سے روشناس کروایا ہے۔عزلتؔ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔اُنھوں نے بھاشا اور ریختہ میں بھی شاعری کے ساتھ ساتھ علومِ عقلیہ اور دینیہ کے علاوہ موسیقی ومصوّری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ عزلتؔ بھاشا شاعری میں نرگن تخلص اِستعمال کرتے تھے۔ اِس کتاب کی اہمیت وافادیت کے تعلق سے ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''عبدالولی عزلتؔ پر آپ کی نہایت عمدہ کتاب ''عطرِ گل مہتاب'' اُس وقت آئی تھی جب میں ملک کے باہر تھا۔آپ نے ولیؔ عزلتؔ کو نئے زبانوں کے پڑھنے والوں کے لیے معروف اور سہل بنادیا۔ یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔''نرگن'' والا باب خاص طور پر اپنے لیے معلوماتی اور کارآمد معلوم ہوا۔مجموعی حیثیت سے آپ کی یہ کتاب اُردو تنقید اور تحقیق میں قابلِ قدر کارنامہ ہے۔'' (''زاویہ نظر'' مشمولہ ''عالمگیر اَدب''، ''اسلم مرزا فن اور شخصیت''، جولائی 2011، ص۔299)

اسلم مرزا کی تیسری تصنیف ''گلدستہ خوش باس'' ہے جو 2009ء میں شائع ہوئی ۔ یہ کتاب ولیؔ اورنگ آبادی سے اُن کی محبت اور عقیدت کا ثبوت ہے۔گلدستہ خوش باس ولیؔ دکنی کے مطالعہ میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اِس میں وہ تمام مواد اکٹھا کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی عنوان سے ولیؔ سے منسوب ہے اور اس کتاب میں جملہ نو (۹) اَبواب شامل ہیں اور ہر باب کا نام ولیؔ کے شعر سے لیا گیا ہے ۔ پہلا باب ''گلزارِ عاشقاں'' ہے جس میں وہ اشعار ہیں جن میں شعرائے معتقدین نے ولیؔ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔دوسرا باب جس کا نام ''آہنگِ زبانِ دل'' یہاں اُن شعراء کے اَشعار درج ہیں جنھوں نے ولیؔ کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں، جن میں حاتمؔ سے امیر مینائیؔ کے عہد کے شعراء شامل ہیں۔ باب سوم جس کا نام ''عکسِ آئینہ خیال'' ہے جس میں ولیؔ کے ہم عصر اور بعد کے شعراء کی نظمیں شامل ہیں۔ باب چہارم ''نقاش رنگ آمیز'' میں ان نظموں کو شامل کیا گیا ہے جن میں ولیؔ کو خراجِ تحسین وخراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔باب پنجم ''بلبلیں رنگیں بیاں'' شادعارفی سے تا حال کے شعراء کی مکمل غزلیں جنھوں نے ولیؔ کی زمینوں میں کہی ہیں ۔ باب ششم ''برمزارِ غریباں'' وہ نظمیں شامل ہیں جو 2002ء میں احمد آباد میں ولیؔ کے مزار کو نیست و نابود کیے جانے پر ہندی اور گجراتی شعراء نے بطور احتجاجاً لکھی تھیں، اِن نظموں کے تراجم شامل ہیں۔باب ہفتم ''نگاہِ پاک بازاں'' ہے جس میں ایسے قطعات کو شامل کیا گیا ہے جو ولیؔ کی

www.urduacademyts.com

تعریف وتوصیف میں کہے گئے ۔ باب ہشتم ''دامنِ گل چیں'' ہے جن شعراء نے ترجیع بند اور مستزاد کہے ہیں اُن کا کلام شامل ہے۔ باب نہم ''بہار آئے باغ جاں'' ہے۔ اِس باب میں اُن تمام شعراء کے مختصر سوانحی تعارف کو پیش کیا گیا ہے، جن کے کلام کے نمونے اِس کتاب میں شامل ہیں۔

''گلدستہ خوش باش'' جملہ 318 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے جو ولؔی کے فکر وفن پر معلومات کے خزانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلم مرزا کی تحقیق پر اِظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

''آپ نے شعراء کی جانب سے ولؔی کی عظمت کو گلہائے عقیدت اِس عمدگی سے پیش کیے ہیں کہ یہ گلدستہ عالمانہ کام کے اَعلیٰ و ارفع معیار کو پہنچ گیا۔'' (حوالہ: ''بصارت سے بصیرت تک''، مضمون مشمولہ ''اسلم مرزا بحیثیت محقق'' اَز محمد علی اثؔر، 2012ء، ص۔356)

کتاب کے پیشِ گفتار میں اسلم مرزا ولؔی کو دلائل وشواہد کی روشنی میں اُردو غزل کا باوا آدم ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولی محمد ولؔی بلا شک و شبہ اُردو غزل کے باوا آدم ہیں۔ ولؔی کے پیشرو شعرا میں کیا دکن کیا شمال ہمیں ایسا عظیم المرتبت، عہد ساز، قد آور اور جینیس اور خوش رنگ لب ولہجہ کا شاعر نظر نہیں آتا جس نے اُردو غزل کو نئے شعری اِمکانات سے روشناس کیا ہو۔ ولؔی اُردو غزل کا وہ اوّلین بلبلِ رنگیں بیان ہے جس نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے غزل کے دائرے کو وسعت اور معنویت کے ساتھ ساتھ ایسی ہمہ گیریت عطا کی ہے کہ آج تک غزل کے حسن وجمال، اُس کی دلفریبیوں، نزاکتوں اور عشوہ طرازیوں کے باہر کسی شاعر نے قدم نہیں رکھا۔'' (حوالہ: مشمولہ ''پیش گفتار'' کتاب ''گلدستہ خوش باس'' اَز اسلم مرزا)

اِس کتاب میں اسلم مرزا نے ولؔی کے حوالے سے ایسے حیرت انگیز اور لافانی عناصر کو تلاش کیا ہے جو کئی برسوں تک غزل کے شریکِ سفر رہے ہیں۔ اس کتاب کے تعلق سے ماہر دکنیات پروفیسر محمد علی اثر لکھتے ہیں:

''ولؔی اورنگ آبادی کی شاعری کو اُردو غزل کے وسیع پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے اور اِس دیوقامت شاعر کے مقام ومرتبہ کے تعین کے سلسلے میں نیز ولؔی کے سفر شمالی ہند اور اس کے دوررس نتائج کی نشاندہی کے سلسلے میں کسی ایک شخص کی مرتبہ اس سے بہتر اور مفید کتاب منظر عام پر نہیں آتی۔ (حوالہ پروفیسر محمد علی اثؔر، مضمون ''اسلم مرزا بحیثیت محقق''، مشمولہ ''عالمگیر اَدب''، اسلم مرزا شخصیت اور فن''، مدیر عارف خورشید، 2007ء، ص:60)

اسلم مرزا کی چوتھی تصنیف ''دکن دیس کی پیش رو غزلیں'' (سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک) ایک ایسی تصنیف ہے جو اپنے موضوع پر منفرد ہے۔ اس کتاب میں سولہویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک 117 دکنی شعراء کے کلام اور ان کا مختصر مگر جامع

www.urduacademyts.com

تعارف شامل ہے۔ یہ ایک ایسی تحقیقی دستاویز ہے جو غزل کی تاریخ کے ایک باب کی تفصیل کا احاطہ کرتی ہے۔ اس تصنیف میں اُنھوں نے بیجا پور اور گولکنڈہ کے علاوہ اپنی تحقیق کا دائرہ آصف جاہی عہد کے دکنی شعراء تک پھیلایا ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت و افادیت اور معنویت کا کینوس وسیع ہو گیا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ ممتاز نقاد، محقق اور شاعر ڈاکٹر اشفاق انجم نے سُپر دِ قلم کیا ہے اور بڑے جامع اَنداز میں اُسلوب کے ساتھ گفتگو کو ایک نتیجے تک پہنچایا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اُردو دکن ہی میں آنکھ کھولی اور وہ شمالی ہند کے محققین سے اس بات پر نالاں اور شاکی ہیں کہ وہ اُردو کی جائے پیدائش کو شمالی ہند سے منسوب کرتے ہیں۔

اس کتاب کے مقدمہ میں کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق انجم مزید لکھتے ہیں:

'' مرزا صاحب نے نہایت جانفشانی اور جگر کاری سے کام لیتے ہوئے دکنی شعراء کی سوانحی تحقیقی اَسناد کے ساتھ پیش کی ہیں بلکہ اُن کی غزلیں بھی تلاش کی ہیں جو پہلی بار یکجا اس کتاب میں درج ہوئی ہیں اور یہ کتاب اس امر کی دلیل ہے کہ نہ صرف اُردو کی پیش رو غزلیں ہیں بلکہ دکنی زبان میں اُردو کی اصل اور جڑ ہے۔''

(حوالہ: ڈاکٹر اشفاق انجم، مقدمہ ''دکن دیس کی پیش رو غزلیں''، اَز اسلم مرزا، 2016ء، ص:21)

اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلم مرزا نے بڑی انتھک محنت، کاوشوں اور باریک بینی سے برسوں مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب میں جن کتابوں سے اِستفادہ کیا گیا ہے اُن کی فہرست اور قدیم دکنی الفاظ کے معنی بھی شاعر کے کلام کے آخر میں دیئے گئے ہیں۔

اسلم مرزا نے اِس کتاب میں اُردو غزل کے باوا آدم شاعر ولی اورنگ آبادی، سراج اورنگ آبادی، شفیق اورنگ آبادی اور ابنِ نشاطی وغیرہ کے اشعار کو شامل کیا ہے۔ ان شعراء کے کلام کو پڑھنے سے دکنی اردو میں لسانی سطح پر بتدریج ہونے والی تبدیلیوں اور سمت و رفتار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بعض تو ایسے شعراء شامل ہیں جن پر ہمارے پیش رو محققین کی نگاہ بھی نہیں پڑی۔ مضمون کے آخر میں اسلم مرزا کی ان تحقیقی خدمات پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر راہی فدائی کا لکھا ہوا کوٹیشن ملاحظہ فرمائیں:

''اسلم مرزا صاحب شکریہ کے مستحق ہیں، انھوں نے ایک طرف شعرائے پیش رو کی یاد تازہ کردی۔ دوسری طرف آپ کی اِس سعیِ مشکور سے غزل کی ترقی و ترویج اور اس کی رفتار و گفتار کے عہد بہ عہد احوال و آثار کا پتہ چلتا ہے جو لسانیات کے ماہرین کے لیے غور و فکر کا منبع و ماخذ رہے گا۔''

•◆•

سیدہ فاطمہ النساء اسماء
پی۔ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر، شعبہ اُردو، ساتاواہنا یونیورسٹی، کریم نگر۔505002 (تلنگانہ اِسٹیٹ)

www.urduacademyts.com

وہ کوئی اور تھا.....!!

ڈیڈی چونکہ آئی پی ایس آفیسر تھے اس لئے ہر دو چار سال میں کہیں نہ کہیں ٹرانسفر ہوتا رہتا تھا۔ اس بار ڈیڈی کا ٹرانسفر حیدرآباد سے دہرہ دون ہوا تھا۔ ہم لوگ بہت خوش تھے۔ یہ علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ اور بیچ میں چھوٹی سی جھیل ہے جس میں کشتیاں بھی چلتی ہیں۔ ان حسین نظاروں کو دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ ایک ہفتہ بعد ہم لوگ وہاں پہنچ گئے۔ مقامی لوگ بھی بہت اچھے تھے۔ کہتے ہیں پہاڑی لوگ بھولے بھالے اور سادہ زندگی پسند ہوتے ہیں۔ پھل، ترکاری، دودھ دہی وغیرہ سب تازے ملتے ہیں وہ لوگ اجنبیوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ خاص کر سرکاری عہدہ داروں کی۔ عورت مرد سب محنت مزدوری کرتے ہیں اور شام ہوتے ہی یہ لوگ اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ عورتیں عموماً چائے کے باغات میں کام کرتی ہیں اور چھوٹے بچے ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ پہاڑی زبان بڑی میٹھی ہوتی ہے۔

ہمارے گھر کے سامنے فٹ بال گراونڈ تھا۔ اس کے دوسری جانب ایک قدیم گھر تھا جس کی چار دیواری کہیں کہیں سے شکستہ تھی۔ اور یہ گھر برسوں سے یوں ہی بند تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس گھر میں بھوتوں کا بسیرا ہے اور یہاں رات بارہ سے دو بجے کے درمیان ڈراونی آوازیں آتی ہیں۔ پہلے بچاؤ بچاؤ اور پھر ایک لمبی چیخ.....آں.....ں.....اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک سفید اور ایک کالی چادر اوڑھے کوئی سایہ جاتے ہوئے دکھائی دیتا تھا۔ یہ نظارہ لوگ اپنی کھڑکیوں اور دروازوں سے روزانہ دیکھتے اور ڈر جاتے تھے۔ اسی لئے لوگ اس کالونی میں رہنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ لوگوں کو ایسا وہم ہوگیا تھا کہ یہاں رہنے سے بچے اور عورتیں ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔

اڑوس پڑوس کی یہ باتیں سن کر ہم کو بھی یہ آواز سننے کا شوق بلکہ تجسّس ہوا۔ چناں چہ ایک رات ہم سب گھر والے چھپ کر ان آوازوں کو سننے کے لئے انتظار کرنے لگے۔ رات دو بجے کے قریب ایسی ہی دو آوازیں ایک کے بعد ایک آئیں۔۔۔ بچاؤ.....بچاؤ اور پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے پیٹ میں خنجر مار دیا ہو۔

ڈیڈی تو پولیس آفیسر تھے.....کہا کہ ہمیں تو اس واقعہ میں کچھ دال میں کالا نظر آرہا ہے لہذا ہمیں اس معاملہ کی تفتیش کرنی ہوگی۔ چناں چہ ڈیڈی تین دن تک آتے جاتے اس گھر پر نظر رکھنے لگے۔ ایک دن ڈیوٹی سے گھر جلدی آگئے اور شام کی چائے پینے کے بعد بالکونی ہی میں کرسی ڈال کر بیٹھ گئے اور ہر آنے جانے والے پر گہری نظر رکھنے لگے۔ جب پوری طرح اندھیرا چھا گیا تو ڈیڈی نے دیکھا کہ دو نوجوان ایک سفید چادر اور دوسرا کالی چادر اوڑھے پچھلی دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہو رہے ہیں اور رات کوئی ایک بجے کے قریب اسی طرح بچاؤ بچاؤ کی آوازیں آئی اور پھر ایک زوردار چیخ کی آواز سنائی دی۔ اس آواز میں اتنی دہشت تھی جسے سن کر لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے۔ تب یہ دو آدمی اسی طرح سفید اور کالی چادر اوڑھے دیوار پھاند کر تیزی سے چل دیئے۔

www.urduacademyts.com

ڈیڈی تین دن تک اسی طرح واقعہ کی جانچ کرتے رہے۔ چوتھے دن وہ ان نوجوانوں کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی کالی چادر اوڑھ کر پچھلی دیوار پھاند کر اُس گھر میں پہنچ گئے اور ایک کمرے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ وقتِ مقررہ پر وہ نوجوان ہمیشہ کی طرح آئے اور آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ کچھ پیسوں کے لین دین کی بات چیت ہوئی پھر بحث وتکرار ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ کھانے کی چیزیں ساتھ لائے تھے اور ساتھ میں شراب کی بوتل بھی تھی۔ رات کے تقریباً ایک بجے ہمیشہ کی طرح ایک نے کان پر ہاتھ رکھ کر چیخ ماری۔ دوسرے ہی لمحہ ایک اور چیخ ماری اور پھر آں .....ں کی آواز سے گھر گونج اٹھا۔ جب ان کا یہ ڈرامہ ختم ہوا اور وہ اپنی سفید اور کالی چادریں اوڑھ کر باہر کی طرف جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ڈیڈی نے ایک زوردار چیخ لگائی۔ جس سے وہ خود بھی ڈر کر کانپنے لگے۔ اس وقت ڈیڈی بھی سفید چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ تب یہ نوجوان گھبرا کر باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ ڈیڈی نے چہرے پر بھوت کا ماسک بھی لگایا ہوا تھا۔

ڈیڈی نے پیچھے سے ان دونوں کے کالر سے پکڑ لئے اور کہا کہ اصل بھوت تو میں ہوں، تم لوگ اتنے دنوں سے یہاں کیا ڈرامہ کر رہے تھے۔ سچ سچ بتاؤ ورنہ میں تمہیں.....

وہ دونوں ڈر کے مارے کانپ رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے انہوں نے کہا۔ ہمیں سیٹھ کانتی رام نے بھیجا ہے۔

ڈیڈی نے غصہ سے ڈراتے ہوئے کہا۔ اس نے تمہیں بھیجا ہے تو اس کا کوئی مقصد بھی ہوگا؟

انہوں نے کہا ''سیٹھ یہ گھر کم داموں میں خریدنا چاہتا ہے..... لیکن مالک مکان بیچ نہیں رہا ہے اور قیمت بہت زیادہ مانگ رہا ہے۔ اس لئے سیٹھ نے یہ چال چلی ہے تاکہ یہ گھر کوئی دوسرا خرید نہ سکے۔

ڈیڈی نے ان سے پوچھا ''یہ کام تم لوگ کب سے کر رہے ہو؟''

انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''چار سال سے''۔

''سیٹھ نے اب تک تمہیں کتنے پیسے دیے ہیں؟''

انہوں نے کہا ''اب تک وہ ہمیں چالیس ہزار دے چکا ہے۔ ہر سال دس ہزار دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

ڈیڈی نے کہا ''یہ تو فراڈ ہے۔ تمہیں اس جرم کی سزا کم سے کم تین سال قید بامشقت ہوسکتی ہے''۔

تب ڈیڈی نے اپنے چہرے سے ماسک ہٹایا اور کہا کہ میں پولیس آفیسر ہوں۔ یہ سنتے ہی ان کے ہاتھوں سے طوطے اڑ گئے اور پھر بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔ ڈیڈی نے اپنی سرویس ریوالور نکال لی اور ہوا میں فائر کر دیا۔ رات کے وقت فائر کی آواز سنتے ہی کالونی کے سارے لوگ جمع ہوگئے اور اس گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ تب ڈیڈی نے ان دونوں مجرموں کو پکڑ کر عوام کے سامنے بے نقاب کیا اور انہوں نے ساری کہانی کالونی کے لوگوں کو سنائی۔ ڈیڈی کی جرأت سے سیٹھ کے جرم کی داستان سب کے سامنے آئی۔ کالونی کے تمام لوگوں نے ڈیڈی کی جرأت کی سراہنا کی اور چین کی سانس لی۔

☆☆☆

ڈاکٹر محبوب فرید
ایڈیٹر ماہنامہ شاداب انڈیا۔ حیدرآباد
Cell:9885398282

افسانہ

www.urduacademyts.com

تیسری شخصیت

وہ غضب کا تخلیق کار تھا۔ کیا اُمرا، غربا کیا...؟ کیا بوڑھا، جوان کیا...؟ کیا ہندو، مسلمان کیا...؟ سب ہی کو پسند تھا وہ۔ یعنی کہ ہر دِل عزیز اور ماہرِ نفسیات افسانہ نگار بھی۔ جو بھی اُس کو پڑھتا، سر دھننے لگتا، جیسے خود کو پڑھ رہا ہو۔ اُس کی زندگی کیا، مجسّم مجموعۂ مشاہدات ہو جیسے۔ دنیا کے ناٹک میں جس کردار کو بھی دیکھتا، بس جنوں کی حد تک۔ صرف پھول ہی نہیں خار کو بھی۔ دور ہی سے نہیں، قریب سے، چھو کر بھی، بل کہ چبھو بھی لیتا، دل و دماغ میں۔ درد ہی نہیں، لذّت بھی محسوس کرتا۔ غرض کہ ہر گام، ہر موڑ پر، دنیا کی ہر شے میں ڈھل جاتا وہ۔ چرند و پرند میں بھی۔ جسم میں روح کی مانند۔ کیا معاشرہ، حکومت کیا، جہاں پر بھی کسی کی حق تلفی محسوس کرتا، میگزین کے میگزین بھر ڈالتا۔ جب بھی دو ملک ٹکراتے، اُس کا قلم آگے۔ جب بھی دو قومیں لڑتیں، اُس کا قلم خون روتا۔ دنیا بھر کے قلم کاروں کی تخلیقات برائے اصلاح آتیں اُس کے پاس۔ وہ کبھی اُن میں، کبھی اپنی تخلیقات میں محو رہتا۔ بڑے بڑے تخلیق کار ٹکراتے اُس کے یہاں۔ ادبی نشست ہو یا سیمینار، اُس کے بنا ادھورے رہتے۔ مختلف میگزینز کے ایڈیٹرز، پبلشرز اور پریس رپورٹرز کے علاوہ ریڈیوز اور ٹی ویز چینلز والے تک اُس کی تخلیقات اور انٹرویوز کے لیے اُس کے ہاں پڑے رہتے۔ حکومت اُسے دن اعزازی تمغات سے نوازتی رہتی۔ فلمی ستارے، اُس کے ساتھ تصاویر بنوانے کے مواقع تلاشتے۔ وہ شہد کی مکھی کی مانند اپنی تخلیقات کے ذریعے صاف ستھرے معاشرے کی تشکیل میں منہمک رہتا۔ اُس کے پاس مجھ جیسے مدرّس کے لیے وقت کہاں..؟ اور اُس کا وقت ضائع کرنے کی مجھ میں کہاں ہمّت ...؟ میرا مکان اُس کے ریڈنگ روم کے ٹھیک سامنے تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس عظیم تخلیق کار نے نہ جانے کتنی بار میری نفسیات کو ٹٹول کر اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہوگا بھلے برے طریقوں سے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اُس کا میرے متعلق نظریہ اچھا نہ تھا، کیوں کہ مجھ کو یاد ہے کئی سال پیشتر میں نے بڑی جُرأت سے اُس کے ریڈنگ روم میں قدم رکھا تھا۔ وہ اُس وقت بھی کسی اہم کاوش میں مصروف تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اُس نے اپنا کاغذ قلم سمیٹ کر، اپنا چشمہ اُتارتے ہوئے مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا، میں سوچ ہی رہا تھا کہ بات شروع کہاں سے کروں کہ اُس نے معاً سوال کر دیا، ''جانتے ہو انسان کی شخصیات کتنی ہوتی ہیں...؟'، اور اپنے غلط پھنس جانے کا شدّت سے احساس ہوا مجھ کو۔

وہ فوراً تاڑ گیا، بولا، ''تین شخصیات، ہر شخص کی، تمھاری بھی۔ جانتے ہو کون سی ہوتی ہیں، وہ تین شخصیات...؟''

www.urduacademyts.com

مجھ کو خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا، ''ایک شخصیت وہ جس کو تم پوز کر رہے ہو، دوسری وہ جو زمانہ جانتا ہے کہ تم ہو کیا..؟ اور تیسری وہ جو واقعی تم ہو اندر سے، یعنی کہ چھپے ڈھکے۔''

مجھ کو لگا جیسے اُس نے میرے من کا چور پکڑ لیا ہو۔ چھپے ڈھکے۔''

مجھ کو لگا جیسے اُس نے میرے من کا چور پکڑ لیا ہو۔

وہ پھر مخاطب ہوا۔ ''تمھارا اپنی تیسری شخصیت کو چھپائے رکھنا، اور کسی کا اُس کو پڑھ لینا، دونوں ہی بڑے فن ہیں، بہت بڑے فن۔ جو اس فن کو جان لے، وہی فنکار ہے۔ میرا مطلب یہ کہ تم میں اپنی تیسری شخصیت کو چھپانے اور میری تیسری شخصیت کو پڑھ لینے کی صلاحیت نہیں، تو تم فن کار نہیں، اور اگر مجھ میں ہے، تو میں ہوں کامیاب فن کار۔ سمجھے....؟''

میں مکمّل طور پر پکڑ گیا تھا۔ کیوں کہ اُس نے مجھ کو اُٹھ جانے کا اِشارہ کر دیا، جیسا کہ میں چاہتا تھا۔ اور میں پنجڑے کے پنچھی کی مانند نکل آیا۔ پھر تو کبھی میں نے اُس کے سامنے جانے کی جسارت نہ کی۔

فرقہ پرستی کی آگ بھڑکی تو اُس نے مجھے اور میرے بیوی بچوں کو اپنے گھر بلا لیا۔ کیوں کہ میں اُس علاقے میں تنہا تھا، اور وہ اُس علاقے کا بارسوخ شخص۔ اُس دوران سیکڑوں منادر اور مسجدیں توڑی گئیں۔ گلی کوچے خون سے رنگ گئے۔ محلّے والوں نے اُس سے میرا مطالبہ کیا، مگر اُس نے سختی سے انکار کر دیا۔ محلّے کے کسی شخص میں اُس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ تھی۔ مکان کے اندر عورتیں تھیں، اور میں ریڈنگ روم میں اُس کے ساتھ تھا۔ اُس دوران میں نے دیکھا کہ راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں تھیں اُس کی۔ وہ جو بھی لکھتا، کاٹ دیتا۔ پھر لکھتا، پھاڑ دیتا۔ پھر لکھتا، فیئر کرتا، بڑبڑاتا، پھر پھاڑ دیتا، پھر لکھتا۔ اُس سے بات کرنے کی ہمّت تو ویسے بھی نہ تھی مجھ میں، اُس پر اِس طرح بار بار لکھنے اور پھاڑنے کے جنون نے اور سہما دیا تھا مجھ کو۔ ہاں اُس کے بڑبڑانے سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ کیا لکھنا چاہتا تھا۔

وہ اکثر اپنی تخلیق کاٹتے اور پھاڑتے وقت بڑبڑاتا، ''یہ کچھ نہیں، تخلیق تو ایسی ہونا چاہیے کہ اُس کو پڑھنے کے بعد فرقہ پرستی کا شعلہ سدا کے لیے راکھ ہو جائے، اگر ایسا نہ ہوا تو میں فنکار ہی کیا۔'' اُس کے اِس طرح کے جملے میری آنکھوں کی چمک بڑھا دیتے اور میں اُس کو عقیدت سے تاکنے لگتا۔ وہ اکثر ٹہلتا۔ مکان میں چلا جاتا۔ لان سے سارے پھول توڑ لاتا، اور میز پر باپو جی کی تصویر کے سامنے ارپت کر کے، دونوں ہاتھ جوڑ کر کہتا، ''دیکھو باپو...! یہ کیا ہو رہا ہے تمھارے دیش میں...؟ کیا یہی تھا تمھارا سپنا..؟''

انشائیہ

www.urduacademyts.com

وقت پر اُس کے سامنے کھانا لگا دیا جاتا۔کبھی کبھار دو ایک نوالے مار لیتا میرے ساتھ۔کبھی ایک آدھ گھونٹ چائے اُتار لیتا۔اکثر چائے ٹھنڈی ہو جانے کی وجہ سے اُس کے سامنے سے ہٹالی جاتی۔ہاں پانی کی صراحی اُس کے سامنے رہتی ۔جب بھی گھبراتا، دو ایک گلاس پانی چڑھا کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ہونٹ چلتے ،سر ہلتا، ہاتھ اور آنکھیں چلتیں۔لائبریری کی کتابیں اُلٹی پلٹی جاتیں ۔وقت پر ریڈیو سے نیوز سُن لیتا۔سڑکوں پر خون کی ہولیاں کھیلی جارہی تھیں، مگر اُس کی تخلیق مکمّل نہ ہو پارہی تھی۔دو دِن ،چار دِن، پھر پورے آٹھ دِن،۔پھر آہستہ آہستہ حکومت نے حالات پر کنٹرول کر لیا۔

کرفیو ہٹا۔بازار کھلے۔اور میں آپنے گھر آ گیا۔

تقریباً چھ ماہ بیت گئے ۔ایک روز کنٹرول کی دکان پر ٹکرا گیا میں اُس سے۔اُس کے یہاں پندرہ روز رہنے کے بعد اُس سے بات کرنے کی ہمّت کسی حد تک آ گئی تھی مجھ میں۔رسماً سلام دعا کے بعد، اُس کے یہاں رہنے کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے میں بات کرنے کا موضوع تلاشنے لگا۔اچانک اُس کے لکھنے کا جنون میرے ذہن میں کوند گیا، اور میں اُس سے دریافت کیا۔''بابو جی وہ کہانی، فساد والی...؟''

''ہاں، ہاں تیار ہے وہ کہانی، بالکل تیار۔''

''آپ نے کہا تھا کہ اُس کی اشاعت کے بعد، پھر کوئی فساد نہ ہوگا۔''

''ہاں، بالکل نہیں ہوگا فساد، اُس کی اشاعت کے بعد۔ملک کے سارے لوگ ایک ہی گھاٹ پئیں گے پانی ،جان دے دیں گے ایک دوسرے پر۔لیکن شائع بھی تو ہو وہ تخلیق۔''

''کہاں بھیجا ہے اُس کو...؟''

''کہاں بھیجا ہے...؟ابھی کہیں نہیں۔کہانی کی اشاعت کا ایک خاص وقت ہوتا ہے۔وقت پر شائع ہو، تب ہی اُس کی اہمیت ہوتی ہے۔سوچتا ہوں کہ کہیں فساد ہو کس کر، خون خرابے ہوں جم کر۔تب ہی تو بھیجوں اُس کو کہیں۔

اُس کی بات سن کر میرا سر گھوم گیا۔میرے سامنے آج تک ناچ رہی ہے اُس کی تیسری شخصیت۔

☆☆☆

حنیف سیّد
۳۴ / ۱۲، سوئی کٹرا
آگرہ ۲۸۲۰۰۳۔(یو، پی)

www.urduacademyts.com

غزلیں

مومن خان شوقؔ

وقت کا کیا ہے، تقاضا نہیں دیکھا جا تا
عشق میں ادنیٰ و اعلیٰ نہیں دیکھا جاتا

ایک ہی وقت میں جل جائے تو پیچھا چھوٹے
زندگی بھر کا سلگنا نہیں دیکھا جاتا

یہ شب وروز، یہ الجھن، یہ بدلتے منظر
رات دن کا یہ تماشا نہیں دیکھا جا تا

آئینہ دیکھ کے، ہم خود کو نہ پہچان سکے
اپنے چہرے کا بکھرنا نہیں دیکھا جاتا

جانے حالات ہمیں اور دکھائیں کیا کیا
نسل نو کا یہ بہکنا نہیں دیکھا جاتا

شوقؔ اُس خواب کی تعبیر ملی ہے ایسی
اب کوئی خواب سہانا نہیں دیکھا جا تا

oOo

اشرف وِلا، 11-3-723، ملے پلی، حیدرآباد۔
Cell: 9985053093

ڈاکٹر فاروق شکیلؔ

لڑکھڑانے لگے کر دار تو پھر کیا ہوگا
شخصیت ہو گئی مسمار تو پھر کیا ہوگا

جوڑ کر آپ نہ رکھیں گے اگر رشتوں کو
اُٹھ گئی صحن میں دیوار تو پھر کیا ہو گا

تم زباں رکھ کے بھی جو گونگے بنے بیٹھے ہو
چھن گئی طاقت گفتار تو پھر کیا ہو گا

آبیاری میں تساہل کو بر تنے والو
بے ثمر ہو گئے اشجار تو پھر کیا ہو گا

وقت کا آپ اگر یونہی اڑائیں گے مذاق
چل گئی وقت کی تلوار تو پھر کیا ہو گا

ہوش بھی ساتھ نہ دیں، کر نہ سکیں گر توبہ
آخری وقت ہوں لاچار تو پھر کیا ہو گا

غرق کرنے مجھے کوشاں ہے سمندر تو شکیلؔ
کر دے بیڑا وہ مرا پار تو پھر کیا ہوگا

oOo

مکان نمبر: 17-1-211/A/B، بانونگر،
سنتوش نگر، حیدرآباد۔059 500

www.urduacademyts.com

سردار سلیم

نظم

"بھارت کا سپنا"

میں نے کل اک سپنا دیکھا
جنت کا اک نقشہ دیکھا
اجلا اجلا کوہ ہمالہ
جیسے کوئی نور کا ہالہ
گنگا جمنا دودھ کی نہریں
سرجو میں ہیں شہد کی لہریں
راوی جہلم چناب ستلج
رنگ برنگی پیاری سج دھج
کھیت میں چاندی ریت میں سونا
چمکے دیش کا کونا کونا
چھاؤں ہے چندن دھوپ ہے افشاں
رستے ہیں مخمل کی دریاں
اتری ہیں ساون کی پریاں
جھولا جھول رہی ہیں سکھیاں
مست ہیں سب کے سب خوشیوں سے
کھیلیں پھولوں کی لڑیوں سے
ہتھیاروں کا نام نہیں ہے
جنگ سے کوئی کام نہیں ہے
سرحد ہے للکار سے خالی
پھاٹک پہریدار سے خالی
چھٹی پر ہیں فوجی سارے
موج میں ہیں من موجی سارے
ہر دن عید ہے دیوالی ہے
خوشحالی ہی خوشحالی ہے
پھول شگوفے غنچے کلیاں
جنت سے بھی پیاری گلیاں
کاش کہ یہ سب سچ ہو جائے
شبنم پتوں کو دھو جائے
پورا اپنا سپنا ہووے
بھارت ہو تو ایسا ہووے

جمال عباس فہمیؔ

غزل

دل میں :.:*ت ہیں مچلنے کو
ایک آتش فشاں ہے پھٹنے کو

دل تو مردہ پڑا ہے مدت سے
کچھ بہانا تو ہو دھڑکنے کو

میری ہر بات بے اثر ٹھہری
وہ تو راضی نہیں سمجھنے کو

وقت ملتا نہیں ہے کیا کیجے
دل کے آنگن میں بھی ٹہلنے کو

ذات میں قید ہوں میں مدت سے
جی نہیں چاہتا نکلنے کو

یاس کی رات ڈھلتی جاتی ہے
ماہِ امید ہے نکلنے کو

سامنے اس کے لب نہیں کھلتے
کیا کہوں اپنے اس ہچکنے کو

اپنا سامان باندھ لو فہمیؔ
وقت بھی کہہ رہا ہے چلنے کو

oOo

اعجاز منزل، نزد ظہ دواخانہ، موہ لاڑکا، امروہہ۔ 244221، جے پی نگر، اتر پردیش۔

www.urduacademyts.com

غزلیں

ارشدؔ شرفی

اب کوئی زخم ہم سے دکھا یا نہ جائے گا
آنکھوں سے کوئی اشک گرایا نہ جائے گا

ظالم میں دست بستہ ہی رہتا ہوں اِس لئے
یہ ہاتھ بد دُعا کو اُٹھایا نہ جائے گا

ذہنوں کی کج روی کی کوئی اِنتہا نہیں
اب خار و گُل میں فرق بھی پایا نہ جائے گا

اِس رہ گُزارِ عِشق میں ہوتے ہیں سرفراز
راہوں سے عاشِقوں کو ہٹایا نہ جائے گا

تو ہی تصوّرات میں رہتا ہے جلوہ گر
تیرے بغیر دِن یہ گُزارا نہ جائے گا

یوں تو اُٹھائے رہتے ہیں سب اپنے آپ کو
لیکن گِرے ہوؤں کو اُٹھایا نہ جائے گا

بے سائیگی کے ساتھ کڑی دُھوپ میں ہوں میں
منزل پہ میری آپ سے آیا نہ جائے گا

آنکھیں یہ اشکبار یہ بے دم سی سسکیاں
ارشدؔ یہ حال اُن کو دِکھایا نہ جائے گا

OOO

اے آر پرائیڈ روبرو مینا گارڈن فنکشن ہال
فلیٹ نمبر402، 10-3-747 & 747/1
وجے نگر کالونی، حیدرآباد028 500 (تلنگانہ)
موبائل9395550558

یوسفؔ قدیر

زخم کو پھول تو صرصر کو صبا کہتے ہیں
لوگ یوں باتیں سبھی بے سروپا کہتے ہیں

اس کے دل میں نہ سہی ہیں تو نظر میں اس کی
بس اسے ہم تو محبت کا صلہ کہتے ہیں

دور افق میں کہیں جیسے کوئی تارا ٹوٹے
اشک آنکھوں سے ٹپک جائے تو کیا کہتے ہیں

عکس اور آئینے میں فاصلہ کتنا ہے کہو
ہے وہ شہ رگ سے قریں اس کا پتہ کہتے ہیں

اس قدر زخم ہیں سیتا ہوں تو کھل جاتے ہیں
بخیہ گر دیکھیں جو خود آ کے تو کیا کہتے ہیں

گر محبت ہے تو تجدید محبت کیسی
عشق میں ہم اسے پیوند قبا کہتے ہیں

میں تو مر جاؤں گا افکار رہیں گے زندہ
اس کو کہتے ہیں فنا اس کو بقا کہتے ہیں

ہے صدا خلق کی نقارہ خدا کا یوسفؔ
کچھ سمجھ کر ہی تجھے لوگ برا کہتے ہیں

OOO

مکان نمبر: 8-3-228/678/1201، سری رام نگر،
یوسف گوڑہ، حیدرآباد۔ 500001 تلنگانہ۔

www.urduacademyts.com

غزلیں

عمران راقمؔ

چھینا ہے یہاں جس نے بچوں سے نوالوں کو
ہے قید کئے وہ بھی نیکی کے حوالوں کو

تخلیق مری ہر دم پھولوں کی طرح مہکی
غزلوں میں نہیں باندھا پامال خیالوں کو

تقدیس جنہیں ہم نے ہر روز عطا کی ہے
بازار میں دیکھا ہے ان زہرہ جمالوں کو

ہر سمت اٹھا یا تو طوفان ہواؤں نے
محفوظ مگر رکھا پھولوں بھری ڈالوں کو

گر ہم نہ محبت میں پاگل سے ہوئے ہوتے
الزام نہ دیتے وہ یوں چاہنے والوں کو

مکتب کے زمانے کی غزلیں ہیں بہت اب بھی
چھپنے کے لئے بھیجی ہم نے نہ رسالوں کو

دانتوں میں پھنسے اکثر چا ول کے کئی دانے
لیکن نہ لیا منہ میں لکڑی کے خلالوں کو

اندر کی ہواؤں سے بھڑ کے نہ کہیں شعلہ
تنہا نہیں رکھتے ہم کمرے میں اجالوں کو

سورج سے نگاہیں جو راقمؔ نہ ملاتے ہوں
وہ قید کریں کیسے جگنو کے اجالوں کو

oOo

3 گرانٹ اسٹریٹ، کولکتہ۔700013
Cell: 9168916117, 9063102672

حمید عکسیؔ

باغ میں بلبل ترانہ آج کل گاتی نہیں
پہلے جیسی رُت بہاروں کی بھی اب آتی نہیں

کوئی گزرا تھا معطر کر کے گاؤں کی فضا
ذہن سے میرے وہ خوشبو آج تک جاتی نہیں

دور سے کس نے پکارا ہے مجھے کیسے کہوں
میرے کانوں تک صدا اس کی مگر آتی نہیں

جو خدا دیتا ہے کافی ہے وہی میرے لیے
دولت دنیا کسی صورت بھی للچاتی نہیں

سچ سے دامن کو بچانے میں لگے ہیں لوگ سب
جھوٹ جو کہتا ہے اس کو شرم تک آتی نہیں

کر کے نیکی عکسیؔ تم تشہیر اس کی مت کرو
''بو ئے گل محسوس ہوتی ہے نظر آتی نہیں''

oOo

مکان نمبر:14-6-39، نظام پورہ، منڈی بازار
ورنگل۔506002 (تلنگانہ)

یوم جمہوریہ کے موقع پر ریاست تلنگانہ کے تمام اقلیتی اداروں کی جانب سے حج ہاوز نامپلی، حیدرآباد میں پرچم کشائی

تصویر میں جناب محمد سلیم چیرمین وقف بورڈ، جناب شاہ نواز قاسم آئی پی ایس، ڈائریکٹر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ وڈائریکٹر، سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی، محترمہ کانتی ویسلی ایم ڈی ریاستی اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کے علاوہ تمام اقلیتی محکمہ جات سے وابستہ عہدیداران واراکین عملہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

Urdu Monthly
Qaumi Zaban
AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY
Vol. 07 No. 02 & 03 February, March 2022

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622
RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022
Date of Publication : 15th of every month
Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

Converted by PDF to JPG
https://www.PDF-Helper.com/pdf-to-jpg/

جناب کوپُولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درجہ فہرست طبقات، اقلیتی بہبود، بہبودی معمرین ومعذورین حکومت تلنگانہ، عہدیداران اقلیتی بہبود کے ساتھ اقلیتی امور اور پروگرامس کے بارے میں جائزہ اجلاس میں۔ تصویر میں مشیر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ جناب اے کے خان (ریٹائرڈ)، جناب احمد ندیم آئی اے ایس پرنسپال سکریٹری اقلیتی بہبود، جناب شاہنواز قاسم آئی پی ایس ڈائریکٹر اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ و ڈائریکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی، جناب بی۔ شفیع اللہ سکریٹری تلنگانہ اقلیتی تعلیمی ادارہ جات سوسائٹی و دیگر عہدیدار دیکھے جاسکتے ہیں۔

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone : 91-04-23237810, Fax : 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com